پریم پچیسی

حصہ دوم

مصنفہ

منشی پریم چند

مصنف پریم بتیسی - بازار حسن وغیرہ

دارالاشاعت پنجاب لاہور

فہرست مضامین

۱	خون سفید	۷
۲	صرف ایک آواز	۳۱
۳	اندھیر	۴۷
۴	بانکا زمیندار	۶۰
۵	تریا چرتر	۸۱
۶	امرت	۱۱۵
۷	شکاری راجکمار	۱۳۳
۸	کرموں کا پھل	۱۵۵
۹	مناون	۱۷۱
۱۰	مرہم	۱۹۳
۱۱	اماوس کی رات	۲۴۷
۱۲	غیرت کی کٹاری	۲۶۹
۱۳	منزل مقصود	۲۸۵

خون سفید

(۱)

چیت کا مہینہ تھا۔ لیکن وہ کھلیاں جہاں اناج کے سنہرے انبار لگتے تھے۔ جان بلب مویشیوں کے آمگاہ بنے ہوئے تھے جن گھروں سے پھاگ اور بسنت کی الاپیں سنائی دیتی تھیں۔ وہاں آج تقدیر کا رونا تھا۔ سارا چوماسا گزر گیا۔ پانی کی ایک بوند نہ گری۔ جیٹھ میں ایک بار موسلادھار مینہ برسا تھا۔ کسان پھولے نہ سماتے۔ خریف کی فصل بو دی۔ لیکن فیاض اندر نے اپنا سارا خزانہ شاید ایک ہی بار لٹا دیا۔ پودے اُگے۔ بڑھے اور پھر سوکھ گئے۔ مرغزاروں میں گھاس نہ جمی۔ بادل آتے۔ گھٹائیں اُمڈتیں ایسا معلوم ہوتا۔ کہ جل تھل ایک ہو جائے گا۔ مگر وہ نحوست کی نہیں۔ آرزوؤں کی گھٹائیں تھیں۔ کسانوں نے بہت جپ

تپ گئے - اینٹ اور پتھر دیویوں کے نام سے پہنچ گئے - پانی
کی امیدیں خون کے پرنالے بہ گئے لیکن اندر کسی طرح نہ
پسیجے - نہ کھیتوں میں پودے تھے - نہ چراگاہوں میں گھاس - نہ
تالابوں میں پانی + عجیب مصیبت کا سامنا تھا - جدھر دیکھئے
خستہ حالی - افلاس اور فاقہ کشی کے دلخراش نظارے دکھائی
دیتے تھے + لوگوں نے پہلے گہنے اور برتن گرو رکھے - اور تب
بیچ ڈالے - پھر مویشیوں کی باری آئی - اور جب روزی کا کوئی
سہارا نہ رہا - تب اپنے وطن پر جان دینے والے کسان بیوی
بچوں کو لے کر مزدوری کرنے کو نکلے - جا بجا محتاجوں اور
مزدوروں کی پرورش کے لئے سرکار کی جانب سے امدادی تعمیرات
جاری ہو گئی تھیں - جسے جہاں سجھتا ہوا - اُدھر جا نکلا +

(۲)

شام کا وقت تھا - جادو رائے تھکا ماندہ خستہ حال زمین
پر بیٹھ گیا - اور بیوی سے مایوسانہ لہجے میں بولا " درکھاس نامنجور
ہو گئی " +

یہ کہہ کر آنگن میں زمین پر لیٹ گیا - اس کا چہرہ زرد تھا
اور آنتیں سکڑی ہوئی تھیں - آج دو دن سے اس نے دانے کی

صورت نہیں دیکھی ۔ گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا ۔ گہنے ۔ کپڑے ۔ برتن ۔ بھانڈے سب پیٹ میں سما گئے ۔ گاؤں کا ساہوکار نگاہ عصمت کی طرح آنکھیں چرانے لگا ۔ صرف تقاوی کا سہارا تھا ۔ اُس کی درخواست دی تھی ۔ لیکن افسوس! وہ درخواست بھی نامنظور ہو گئی ۔ امید کا جھلملاتا ہوا چراغ گُل ہو گیا ۔

دیو کی نے شوہر کو ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے ۔ شوہر دن بھر کا تھکا ماندہ گھر آیا ہے ۔ اسے کیا کھلائے ۔ شرم کے مارے وہ ہاتھ پاؤں دھونے کے لئے پانی بھی نہیں لائی ۔ جب ہاتھ پاؤں دھو کر وہ منتظر اور گرسنہ انداز سے اس کی طرف دیکھے گا ۔ تو وہ اسے کیا کھانے کو دے گی اس نے خود کئی دن سے دانے کی صورت نہیں دیکھی تھی ۔ لیکن اس وقت اُسے جو صدمہ ہوا ۔ وہ فاقہ کشی کی تکلیف سے بدرجہا زیادہ سخت تھا ۔ عورت گھر کی لکشمی ہے ۔ گھر کے آدمیوں کو کھلانا پلانا وہ اپنا فرض سمجھتی ہے ۔ اور خواہ یہ اُس کی زیادتی ہی کیوں نہ ہو ۔ لیکن ناداری اور بینوائی سے جو روحانی صدمہ اُس کو ہوتا ہے ۔ وہ مردوں کو نہیں ہو سکتا ۔

یکایک اس کا بچہ سادھو نیند سے چونکا ۔ اور مٹھائیوں

کی صبر آزما خواہش سے بھرا ہوا آکر باپ سے لپٹ گیا۔ اس بچے نے آج صبح کو چنے کی روٹیوں کا ایک ٹکڑا کھایا تھا۔ اور تب سے کئی بار اٹھا۔ اور کئی بار روتے روتے سو گیا۔ چار برس کا نادان بچہ۔ اسے مٹھائیوں میں اور بارش میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ جادو رائے نے اُسے گود میں اٹھا لیا۔ اور اس کی طرف خطاوار نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی گردن جھک گئی۔ اور بیکسی آنکھوں میں سما سکی ؎

۳

دوسرے دن یہ کنبہ بھی گھر سے نکلا۔ جس طرح مرد کے دل سے غیرت اور عورت کی آنکھ سے حیا نہیں نکلتی۔ اُسی طرح اپنی محنت سے روٹی کمانے والا کسان بھی مزدوری کے کھوج میں گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ لیکن فاقہ کشی! آہ تو سب کچھ کر سکتی ہے۔ عزت اور غیرت۔ شرم اور حیا یہ سب چمکتے ہوئے تارے تیری سیاہ گھٹاؤں کے پردے میں چھپ جاتے ہیں ؎

صبح کا وقت تھا۔ یہ دونوں غم نصیب گھر سے نکلے۔ جادو رائے نے لڑکے کو پیٹھ پر لیا۔ دیوکی نے وہ بینوائی کی گٹھڑی سر پر رکھی۔ جس پر افلاس کو بھی ترس آتا۔ دونوں کی آنکھیں

آنسوؤں سے تر تھیں۔ دیوی روتی تھی۔ جادو خاموش تھا۔
گاؤں کے دو چار آدمیوں سے راستے میں مڈبھیڑ ہوئی۔
مگر کسی نے اتنا بھی نہ پوچھا۔ کہ کہاں جاتے ہو۔ کسی کے دل
میں ہمدردی باقی نہ تھی ❊

سورج ٹھیک سر پر تھا۔ جب یہ لوگ لال گنج پہنچے۔
دیکھا۔ تو میلوں تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ لیکن ہر اک
چہرے پر فاقہ کشی اور مصیبت کا ایک دفتر تھا۔ بیساکھ کی وہ
جلتی ہوئی دھوپ آگ کے جھونکے زور زور سے ہرہراتے
ہوئے چلتے تھے۔ اور وہاں ہڈیوں کے بیشمار ڈھانچے جن کے
بدن پر جامۂ عریانی کے سوا کوئی لباس نہ تھا۔ مٹی کھودنے میں
مصروف تھے۔ گویا مرگھٹ تھا۔ جہاں مُردے اپنے ہاتھوں
اپنی قبریں کھود رہے تھے ❊

بوڑھے اور جواں۔ مرد اور بچّے سب کچھ اس بیکسانہ ہمّت
اور یاس سے کام میں لگے ہوئے تھے۔ گویا موت اور فاقہ کشی
ان کے سامنے بیٹھی ہوئی گھور رہی ہے + اس آفت میں نہ کوئی
کسی کا دوست تھا۔ نہ ہمدرد۔ رحم۔ شرافت اور اخلاق یہ سب
انسانی جذبات ہیں۔ جن کا خالق انسان ہے۔ قدرت نے

جانداروں کو صرف ایک خاصیّت عطا کی ہے۔ اور وہ خودغرضی ہے۔ انسانی جذبات جو فارغ البالی کے سنگار ہیں۔ اکثر بیوفا دوستوں کی طرح ہم سے دغا کر جاتے ہیں۔ لیکن یہ فطری خاصیّت دمِ آخر تک ہمارا گلا نہیں چھوڑتی ۔

(۴)

آٹھ دن گزر گئے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ کیمپ کا کام ختم ہو چکا تھا۔ کیمپ سے کچھ دور آم کا ایک گھنا باغ تھا۔ وہیں ایک پیڑ کے نیچے جادو رائے اور دیوکی بیٹھے ہوئے تھے دونوں ایسے خستہ حال تھے۔ کہ ان کی صورت نہیں پہچانی جاتی تھی۔ وہ آزاد کاشتکار نہیں رہے۔ وہ اب فاقہ کش مزدور ہو گئے ہیں ۔

جادو رائے نے بچّے کو زمین پر سلا دیا۔ اُسے کئی دن سے بخار آ رہا ہے۔ کنول سا چہرہ مرجھا گیا ہے۔ دیوکی نے اسے آہستہ سے ہلا کر کہا "بیٹا۔ آنکھیں کھولو۔ دیکھو سانجھ ہو گئی ہے" ۔

سادھو نے آنکھیں کھول دیں۔ بخار اتر گیا تھا۔ بولا۔ کیا ہم گھر آ گئے ماں؟

گھر کی یاد آ گئی۔ دیوکی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے کہا۔ "نہیں بیٹا! تم اچھے ہو جاؤ گے۔ تو گھر چلیں گے۔ اٹھ کر دیکھو کیسا اچھا باغ ہے"۔

سادھو ماں کے ہاتھوں کے سہارے اٹھا۔ اور بولا۔ اماں مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔ لیکن تمہارے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ مجھے کیا کھانے کو دوگی؟"

دیوکی کے کلیجے میں چوٹ لگی۔ ضبط کر کے بولی "نہیں بیٹا! تمہارے کھانے کو میرے پاس سب کچھ ہے۔ دادا پانی لاتے ہیں۔ تو میں نرم نرم روٹیاں بنائے دیتی ہوں"۔

سادھو نے ماں کی گود میں سر رکھ دیا۔ اور بولا "اماں میں نہ ہوتا۔ تو تمہیں اتنا دکھ نہ ہوتا"۔

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ رونے لگا۔ یہ وہی بے سمجھ بچہ ہے جو دو ہفتہ پہلے مٹھائیوں کے لئے دنیا سر پر اٹھا لیتا تھا۔ افلاس نے اور فکر نے کیسا تغیر کر دیا ہے۔ یہ مصیبت کے احساس کا اثر ہے۔ کتنا دردناک۔ کتنا دل شکن!

اسی اثنا میں کئی آدمی لالٹین لئے ہوئے وہاں آ گئے پھر گاڑیاں آئیں۔ ان پر ڈیرے اور خیمے لدے ہوئے تھے۔ دم

کے دم میں وہاں خیمے کھڑے ہو گئے۔ سارے باغ میں چہل پہل نظر آنے لگی۔ دیو کی روٹیاں سینک رہی تھی۔ سادھو بھیڑے وھیڑے اٹھا۔ اور حیرت سے تاکتا ہوا ایک ڈیرے کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا۔

(۵)

پادری موہن داس خیمے سے باہر نکلے۔ تو سادھو اُنہیں کھڑا دکھائی دیا۔ اس کی صورت پر اُنہیں ترس آ گیا۔ محبت کا دریا اُمڈ آیا۔ بچّے کو گود میں اٹھایا۔ اور خیمے میں لا کر ایک گدّے دار کوچ پر بٹھایا۔ تب اُسے بسکٹ اور کیلے کھانے کو دیئے۔ لڑکے نے اپنے بہترین زمانے میں ان نعمتوں کی صورت نہ دیکھی تھی بخار کی بے چین کرنے والی بھوک لگی ہوئی تھی۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اور تب احسان مند نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پادری صاحب کے پاس جا کر بولا۔ "تم ہم کو روز ایسی چیز کھلاؤ گے"؟

پادری صاحب اس بھولے پن پر مُسکرا کر بولے۔ میرے پاس اس سے بھی اچھی اچھی چیزیں ہیں۔ اس پر سادھو رام نے کہا۔ اب مَیں روز تمہارے ساتھ رہوں گا۔ اماں کے پاس

ایسی چیزیں کہاں ہیں۔ وہ تو مجھے چنے کی روٹیاں کھلاتی ہے۔"

اُدھر دیوکی نے روٹیاں بنائیں۔ اور سادھو کو پکارنے لگی۔ سادھو نے ماں کے پاس جا کر کہا۔ "مجھے صاحب نے اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دی ہیں۔ صاحب بڑے اچھے ہیں۔"

دیوکی نے کہا۔ "میں نے تمہارے لئے نرم نرم روٹیاں پکائی ہیں۔ آؤ تمہیں کھلا دوں۔"

سادھو بولا۔ "اب میں نہ کھاؤں گا۔ صاحب کہتے تھے۔ کہ میں تمہیں روز اچھی اچھی چیزیں کھلاؤں گا۔ میں اب اُن کے ساتھ رہوں گا۔"

ماں نے سمجھا لڑکا ہنسی کر رہا ہے۔ اُسے چھاتی سے لگا کر بولی۔ "کیوں بیٹا! ہم کو بھول جاؤ گے۔ میں تمہیں کتنا پیار کرتی ہوں؟"

سادھو طفلانہ متانت سے بولا۔ "تم تو مجھے روز چنے کی روٹیاں دیتی ہو۔ تمہارے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ صاحب مجھے کیلے اور آم کھلائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ پھر خیمے کی طرف بھاگا۔ اور رات کو وہیں سو رہا۔

پادری موہن داس کا وہاں تین دن قیام رہا۔ سادھو دن

پھر انہیں کے ساتھ رہتا۔ صاحب نے اسے میٹھی میٹھی دوائیں دیں۔ اس کا بخار بھی جاتا رہا۔ وہ بھولے بھالے کسان صاحب کو دعائیں دیتے۔ بچّہ چنگا ہے۔ اور آرام سے ہے۔ صاحب کو پرماتما سدا سُکھی رکھے۔ انہوں نے بچّے کی جان رکھ لی۔

چوتھے دن رات ہی کو پادری صاحب نے وہاں سے کوچ کیا۔ اور صبح کو ڈیوکی اٹھی۔ تو سادھوکا بھی وہاں پتہ نہ تھا ڈیوکی نے سمجھا۔ کہیں پیچھے ڈھونڈھنے گیا ہوگا۔ اُس نے جادو سے کہا۔ یہاں للّو نہیں ہے۔ اُس نے بھی یہی کہا۔ کہیں پیچھے ڈھونڈھتا ہوگا۔

لیکن جب سورج نکل آیا۔ اور کام پر چلنے کا وقت آ پہنچا تب جادو رائے کو کچھ اندیشہ ہوا۔ اُس نے کہا۔ تم یہیں بیٹھی رہنا میں ابھی اُسے لئے آتا ہوں۔

اُس نے قرب و جوار کے سب باغ چھان ڈالے۔ اور دس بجتے بجتے ناکام لوٹ آیا۔ سادھو نہ ملا۔ ڈیوکی نے زار زار رونا شروع کیا۔

پھر دونوں اپنے لال کی تلاش میں نکلے۔ طرح طرح کے وسواس دل میں آتے تھے۔ ڈیوکی کو پورا یقین تھا کہ صاحب

نے اس پر کوئی منتر ڈال دیا۔ لیکن جادو کو اس منطق کے تسلیم کرنے میں کچھ خفیف سا شک تھا۔ بچہ اتنی دور انجان راستے پر اکیلا نہیں جا سکتا۔ تاہم وہ دونوں گاڑی کے پہیّوں اور گھوڑے کی ٹاپوں کے نشان دیکھتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ایک سڑک پر آ پہنچے۔ وہاں گاڑی کے بہت سے نشان تھے۔ اس خاص لیک کی تمیز نہ ہو سکی۔ گھوڑے کی ٹاپ بھی ایک جھاڑی کی طرف جا کر غائب ہو گئی۔ امید کا سہارا ٹوٹ گیا۔ دوپہر ہو گئی تھی۔ دونوں دھوپ کے مارے بے چین۔ مایوسی سے نیم جان ہو گئے تھے۔ وہیں ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ ویو کی بلاپ کرنے لگی۔ جادو نے غمگساری کا فرض ادا کرنا شروع کیا۔

جب دھوپ کی تیزی ذرا کم ہوئی۔ تو دونوں پھر آگے چلے۔ لیکن اب امید کی بجائے مایوسی ساتھ تھی۔ گھوڑے کی ٹاپ کے ساتھ امید کا دھندلا نشان غائب ہو گیا تھا۔

شام ہو گئی۔ جا بجا یقینی موت کے انتظار میں بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ یہ دونوں مصیبت کے مارے ہمت ہار کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اسی درخت پر فاختہ کا ایک جوڑا بسیرا لئے

ہوئے تھا۔ اُن کا ننھّا سا بچّہ آج ایک شکرے کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ دونوں دن بھر بے چین اِدھر اُدھر اُڑتے رہے۔ اس وقت ہمّت ہار کر بیٹھ رہے۔ مایوسی نے تشفی دی۔ امید میں اضطراب اور بیکلی ہے۔ مایوسی میں تشفی و تسکین۔ دیو کی اور جادو کی مایوسی میں بھی امید کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس لئے وہ بے چین تھے ؎

تین دن تک یہ دونوں اپنے کھوئے ہوئے لال کی تلاش کرتے رہے۔ دانہ سے بھینٹ نہیں۔ پیاس سے بے چین ہوتے تو پانی کے دو چار گھونٹ حلق کے نیچے اتار لیتے۔ امید کی بجائے مایوسی کا سہارا تھا۔ ہمت کی بجائے بے ہمتی کا ساتھ۔ اشک اور غم کے سوا کوئی زادراہ نہیں کسی بچّے کے پاؤں کے نشان دیکھتے تو ان کے دلوں میں امید و بیم کا ایک طوفان سا اُٹھ جاتا ؎ لیکن ہر قدم اُنہیں منزل مقصود سے دور لئے جاتا تھا ؎

(۶)

اس واقعہ کو چودہ سال گزر گئے۔ اور متواتر چودہ سال ملک میں رام کا راج رہا۔ نہ کبھی اندر نے شکایت کا موقع دیا۔ اور نہ زمین نے۔ اُمڈی ہوئی ندی کی طرح انبار خانے غلّے سے لبریز

تھے۔ اُجڑے ہوئے گاؤں آباد ہو گئے۔ مزدور کسان ہو بیٹھے۔ اور کسان جاگیرداروں کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے۔

وہی چیت کے دن تھے۔ کھلیانوں میں سنہرے اناج کے پہاڑ کھڑے تھے۔ بھاٹ اور بھکاری کسانوں پر دنیا کی نعمتوں کی بارش کرتے نظر آتے تھے۔ سناروں کے دروازے پر سارے دن اور آدھی رات تک گاہکوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ درزی کو سر اٹھانے کی فرصت نہ تھی۔ اکثر دروازوں پر گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ اور دیوی کے پجاریوں کو بدہضمی کا مرض ہو گیا تھا۔

زمانے نے جادو رائے کے ساتھ بھی مساعدت کی۔ اس کے گھر پر اب بجائے کھپریل کے پکی چھت ہے۔ دروازے پر خوش خدمت بیلوں کی جوڑی بندھی ہوئی ہے۔ وہ اب اپنی بہلی میں سوار ہو کر بازار جایا کرتا ہے۔ اس کا جسم اب اتنا سڈول نہیں ہے۔ پیٹ پر فارغ البالی کا خاص اثر نظر آتا ہے۔ اور بال بھی سفید ہو چلے ہیں۔ دیوکی کا شمار بھی گاؤں کی بڑی بوڑھی عورتوں میں ہوتا ہے۔ اور نسوانی مناقشات میں اکثر اس کے فیصلے ناطق سمجھے جاتے ہیں۔ جب وہ کسی پڑوسن کے گھر جاتی ہے۔ تو وہاں کی بہوئیں خوف سے تھرتھرانے لگتی ہیں۔ اس کی نگاہ تیز اور

زبان شعلد ریز کی سارے گاؤں میں دھاک بندھی ہوئی ہے ۔ مہین کپڑے اب اسے نہیں بھاتے۔ لیکن گہنوں کے بارے میں وہ اتنی کفایت شعار نہیں ہے ؛

اُن کی زندگی کا دوسرا پہلو اس سے کم روشن نہیں ہے۔ اُن کے دو اولادیں ہیں۔ لڑکا مادھو سنگھ اب کھیتی باڑی کے کام میں باپ کی مدد کرتا ہے۔ لڑکی کا نام شیو گوری ہے۔ وہ اب ماں کے ساتھ چکی پیستی ہے۔ اور خوب گاتی ہے۔ برتن دھونا اسے پسند نہیں لیکن چوکا لگانے میں مشتاق ہے۔ اس کی گڑیوں کا کبھی بیاہ سے جی نہیں بھرتا۔ آئے دن شادیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہاں ان میں کفایت کا کامل لحاظ رکھا جاتا ہے ؛

مگر گذشتہ سادھو کی یاد ابھی تک تازہ ہے۔ اس کا ذکر اکثر آتا ہے اور کبھی رلائے بغیر نہیں رہتا۔ دیوکی کبھی کبھی دن دن بھر اس لاڈلے بیٹے کی سُدھ میں بیقرار رہتی ہے ؛

شام ہو گئی تھی۔ بیل دن بھر کے تھکے سر جھکائے چلے آتے تھے۔ پجاریوں نے ٹھاکر دوارے میں گھنٹہ بجانا شروع کیا۔ آج کل فصل کے دن ہیں۔ روز پوجا ہوتی ہے۔ جادو رائے گھاٹ پر بیٹھے ناریل پی رہے تھے۔ شیو گوری راستے میں کھڑی اُن بیلوں سا

کو کوس رہی تھی۔ جو اس کے عالی شان محل کی ذرا بھی عزت نہ کر کے اُسے روندتے چلے جاتے تھے ۔

ناقوس اور گھنٹے کی آواز سنتے ہی جادو راے چرنامرت لینے کے لئے اٹھے۔ کہ یکایک ایک شریف صورت خوشرو نوجوان بھونکتے ہوئے کتوں کو دھتکارتا۔ بائیسکل کو ہاتھوں سے دھکیلتا ہوا ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور جھک کر ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ جادو راے نے غور سے دیکھا۔ اور تب دونوں لپٹ گئے۔ مادھو بھونچکا ہو کر بائیسکل کو دیکھنے لگا۔ شیو گوری روتی ہوئی گھر میں بھاگ گئی۔ اور دیوکی سے بولی۔ دادا کو صاحب نے پکڑ لیا ہے۔ دیوکی گھبراتی ہوئی باہر آئی۔ سادھو اُسے دیکھتے ہی اُس کے پاؤں پر گر پڑا۔ دیوکی لڑکے کو چھاتی سے لگا کر زار زار رونے لگی۔ گاؤں کے مرد اور عورتیں اور بچے جمع ہو گئے۔ میلہ سا لگ گیا ۔

(۷)

سادھو نے کہا۔ ماتا جی اور پتا جی! مجھ بدنصیب سے جو کچھ قصور ہوا ہو۔ اُسے معاف کیجئے۔ میں نے اپنی نادانی سے خود بہت تکلیفیں اُٹھائیں۔ اور اب آپ کو بہت دکھ دیا۔ لیکن اب مجھے اپنی گود میں لیجئے ۔

دیوکی نے رو کر کہا۔ جب تم ہم کو چھوڑ کر بھاگے تھے۔ تو ہم لوگ تمہیں تین دن تک بے دانہ بے پانی ڈھونڈھتے رہے جب نراس ہو گئے۔ تو اپنے نصیبوں کو رو کر بیٹھ رہے۔ تب سے آج تک کوئی ایسا دن نہ گیا ہوگا۔ کہ تمہاری سُدھ نہ آئی ہو۔ روتے روتے ایک جُگ بیت گیا۔ اب تم نے جا کے خبر لی ہے۔ بتاؤ بیٹا اُس دن تم کیسے بھاگے۔ اور کہاں جا کر رہے؟

سادھو نے ندامت آمیز محبت سے جواب دیا۔ ماتا جی! اپنا حال کیا کہوں میں پہر رات رہے آپ کے پاس سے اٹھ کر بھاگا پادری صاحب کے پڑاؤ کا پتہ شام ہی کو پوچھ لیا تھا۔ بس پوچھتا ہوا دوپہر کو اُن کے پاس پہنچ گیا۔ صاحب نے مجھے پہلے سمجھایا۔ کہ اپنے گھر لوٹ جاؤ۔ لیکن جب میں کسی طرح نہ راضی ہوا۔ تو انہوں نے مجھے پونا بھیج دیا۔ میری طرح وہاں سینکڑوں لڑکے تھے۔ وہاں بسکٹ اور نارنگیوں کا کیا ذکر۔ اب مجھے آپ لوگوں کی یاد آئی۔ اور میں اکثر روتا۔ مگر بچپن کی عمر تھی۔ دھیرے دھیرے اُنہیں لڑکوں میں ہل مل گیا۔ لیکن جب سے ہوش آیا ہے۔ اور اپنا پرایا سمجھنے لگا ہوں۔ تب سے اپنی نادانی پر ہاتھ ملتا رہا ہوں۔ رات اور دن آپ لوگوں کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ آج آپ لوگوں کی دعا

سے وہ مبارک دن دیکھنا نصیب ہوا۔ بیگانوں میں بہت دن کاٹے
بہت دن تک اناتھ رہا۔ اب مجھے اپنی سیوا میں رکھئے۔ مجھے اپنی
گود میں لیجئے۔ میں محبت اور پیار کا بھوکا ہوں۔ مدتوں سے مجھے یہ
نعمت میسر نہیں ہوئی۔ وہ نعمت مجھے دیجئے؟

گاؤں کے بہت سے بزرگ جمع تھے۔ بوڑھے جگن سنگھ بولے
تو کیوں بیٹا! تم اتنے دنوں پادریوں کے ساتھ رہے۔ انہوں نے
تم کو بھی پادری بنا لیا ہوگا؟

سادھو نے سر جھکا کر کہا۔ جی ہاں یہ تو ان کا دستور ہی ہے؟

جگن سنگھ نے جادو رائے کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ بڑی
کٹھن بات ہے؟

سادھو بولا۔ برادری مجھ سے جو پرائشچت کرائے گی۔ میں
اُسے شوق سے پورا کروں گا۔ مجھ سے جو کچھ برادری کا اپرادھ ہوا ہے
نادانی میں ہُوا ہے لیکن مَیں اس کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں؟

جگن سنگھ نے پھر جادو رائے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا
اور دوراندیشانہ انداز سے بولے۔ ہندو دھرم میں ایسا کبھی نہیں ہوا
ہے۔ یوں تمہارے باپ اور ماں چاہے تمہیں اپنے گھر میں رکھ
لیں۔ تم اُن کے لڑکے ہو۔ مگر برادری کبھی اس کام میں شریک

نہ ہوگی۔ بولو جادو رائے! کیا کہتے ہو۔ کچھ تمہارے من کی بات بھی تو معلوم ہو۔

جادو رائے بڑے دُبدھے میں پڑا ہُوا تھا۔ ایک طرف تو اپنے پیارے بیٹے کی محبت کھینچتی تھی۔ دوسری طرف برادری کا خوف دامنگیر تھا جس لڑکے کے لئے روتے روتے مدتیں گزر گئیں۔ آج وہی کھڑا سامنے آنکھوں میں آنسو بھرے کہتا ہے۔ پتا جی! مجھے اپنی گود میں لیجئے۔ اور مَیں پتھر کے دیوتا کی طرح خاموش بیٹھا ہُوا ہوں۔ افسوس! ان بے رحم بھائیوں کو کیا کروں۔ کیسے سمجھاؤں۔

لیکن ماں کی ممتا نے جوش مارا۔ دیوکی سے ضبط نہ ہُوا۔ اُس نے بیباکی سے کہا مَیں اپنے لال کو اپنے گھر میں رکھوں گی اور کلیجے سے لگاؤں گی۔ اتنے دنوں کے بعد ہم نے اُسے پایا ہے اب اُسے نہیں چھوڑ سکتی۔

جگن سنگھ تیز ہو کر بولے۔ چاہے برادری چھوٹ جائے؟

دیوکی نے بھی تیز ہو کر جواب دیا۔ ہاں چاہے برادری چھوٹ جائے۔ لڑکے بالوں ہی کے لئے آدمی برادری کی آڑ پکڑتا ہے۔ جب لڑکا ہی نہ رہا۔ تو برادری ہمارے کس کام آئے گی۔

اس پر کئی ٹھاکر لال لال آنکھیں نکال کر بولے۔ ٹھکرائن!

برادری کی خوب مرجاد کرتی ہو۔ لڑکا چاہے کسی راستے پر جائے۔ لیکن برادری چوں نہ کرے۔ ایسی برادری کہیں اَور ہوگی۔ ہم صاف صاف کہے دیتے ہیں۔ کہ اگر یہ لڑکا تمہارے گھر میں رہا۔ تو برادری بھی بتا دے گی۔ کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔

جگن سنگھ کبھی کبھی جادو رائے سے قرض دام لیا کرتے تھے مصلحت آمیز لہجے میں بولے۔ بھابھی برادری یہ تھوڑا ہی کہتی ہے کہ تم لڑکے کو گھر سے نکال دو۔ لڑکا اتنے دنوں کے بعد گھر آیا ہے ہمارے سر اور آنکھوں پر رہے۔ بس ذرا کھانے پینے اور چھوت چھات کا بچاؤ رہنا چاہئے۔ بولو جادو بھائی اب برادری کو کہاں تک دبانا چاہتے ہو؟

جادو رائے نے سادھو کی طرف سائلانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ بیٹا! جہاں تم نے ہمارے ساتھ اتنا سلوک کیا ہے۔ وہاں جگن بھائی کی بات اور مان لو۔

سادھو نے کسی قدر ناملائم لہجے میں کہا۔ کیا مان لوں۔ یہی کہ اپنوں میں غیر بن کر رہوں۔ ذلت اٹھاؤں۔ مٹی کا گھڑا بھی میرے چھونے سے ناپاک ہو جائے۔ نا! یہ میری ہمت سے باہر ہے۔ میں اتنا بے حیا نہیں ہوں۔

جادورائے کو لڑکے کی یہ سخت گیری ناگوار گزری۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ اس وقت برادری کے لوگ جمع ہیں۔ اُن کے سامنے اس طرح سمجھوتہ ہو جائے۔ پھر کون دیکھتا ہے۔ کہ ہم اُسے کس طرح رکھتے ہیں۔ چڑھ کر بولے۔ اتنی بات تو تمہیں ماننی ہی پڑے گی ؛

سادھو رائے اس پہلو کو نہ سمجھ سکے۔ باپ کی اس بات میں انہیں بیدردی کا رنگ نظر آیا۔ بولے۔ میں آپ کا لڑکا رہوں گا آپ کی محبت اور شفقت کی آرزو مجھے یہاں تک لائی ہے۔ مَیں اپنے گھر میں رہنے آیا ہوں۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے۔ تو میرے لئے اس کے سوا اَور کوئی چارہ نہیں۔ کہ جس قدر جلد ہو سکے۔ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ جن کے خون سفید ہو گئے ہیں۔ اُن کے درمیان رہنا فضول ہے ؛

دیوکی نے رو کر کہا۔ للّو! مَیں تمہیں اب نہ جانے دوں گی ؛

سادھو کی آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن مسکرا کر بولا۔ مَیں تو تیری تھالی میں کھاؤں گا ؛

دیوکی نے اس کی طرف مادرانہ شفقت سے بھری ہوئی آنکھیں اٹھائیں۔ اور بولی۔ مَیں نے تو تجھے چھاتی سے دودھ پلایا ہے۔ تو میری تھالی میں کھائے گا۔ تو کیا میرا بیٹا ہی تو ہے۔ کوئی اَور تو

نہیں ہوگیا۔

سادھو ان باتوں کو سُن کر متوالا ہوگیا۔ ان میں کتنا پیار۔ کتنا اپنا پن تھا۔ بولا۔ امّاں آیا تو مَیں اسی ارادے سے تھا۔ کہ اب کہیں نہ جاؤں گا۔ لیکن برادری نے میرے سبب سے تمہیں ہٹیا کر دیا۔ تو مجھ سے نہ سہا جائے گا۔ مجھ سے ان گنوار جاہلوں کا غرور برداشت نہ ہوگا۔ اس لئے اس وقت مجھے جانے دو۔ جب مجھے موقع ملے گا۔ تمہارے درشن کرنے آیا کروں گا۔ تمہاری محبّت میرے دل سے نہیں مٹ سکتی۔ لیکن یہ غیر ممکن ہے۔ کہ مَیں اس گھر میں رہوں۔ تو الگ کھانا کھاؤں۔ اور الگ بیٹھ کر۔ اس لئے مجھے معاف کرنا۔

دیو کی گھر میں سے پانی لائی۔ سادھو ہاتھ منہ دھونے لگا۔ شیو گوری نے ماں کا اشارہ پایا۔ تو ڈرتے ڈرتے سادھو کے پاس گئی۔ سادھو نے ادب سے ڈنڈوت کی۔ سادھو نے پہلے ان دونو کو تعجّب سے دیکھا۔ پھر اپنی ماں کو مُسکراتے دیکھ کر سمجھ گیا۔ دونوں لڑکوں کو چھاتی سے لگایا۔ اور تینوں بھائی بہن پریم سے ہنسنے کھیلنے لگے۔ ماں کھڑی یہ پاک نظارہ دیکھتی تھی۔ اور اُمنگ سے پھولی نہ سماتی تھی۔

جلپان کر کے سادھو نے بائیسکل سنبھالی۔ اور ماں باپ کے

سامنے سر جھکا کر چل کھڑا ہُوا۔ وہیں جہاں سے وہ بیزار ہو کر آیا تھا۔ اسی دائرے میں جہاں سب بیگانے تھے۔ کوئی اپنا نہ تھا۔

دیو کی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اور رجادورا ئے آنکھوں میں آنسو بھرے جگر میں ایک اینٹھن سی محسوس کرتا ہُوا سوچتا تھا ہائے! میرا لال یوں مجھ سے الگ ہوا جاتا ہے۔ ایسا لائق اور ہونہار لڑکا ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ اور صرف اس لئے کہ ہمارے خون اب سفید ہو گئے ہیں۔

صرف ایک آواز

صرف ایک آواز

(۱)

صبح کا وقت تھا۔ ٹھاکر درشن سنگھ کے گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ آج رات کو چندر گرہن ہونے والا تھا۔ ٹھاکر صاحب اپنی بوڑھی ٹھکراین کے ساتھ گنگا جی جانے تھے۔ اس لئے سارا گھر اُن کی پرشور تیاری میں مصروف تھا۔ ایک بہو اُن کا پھٹا ہوا کرتا ٹانک رہی تھی۔ دوسری بہو اُن کی پگڑی لئے سوچتی تھی۔ کہ کیوں کر اس کی مرمت کروں۔ دونوں لڑکیاں ناشتہ تیار کرنے میں محو تھیں۔ جو زیادہ دلچسپ کام تھا۔ اور بچّوں نے اپنی عادت کے موافق ایک کہرام مچا رکھا تھا۔ کیونکہ ہر ایک آنے جانے کے موقع پر اُن کا جوش گریہ اُمنگ پر ہوتا تھا۔ جانے کے وقت ساتھ جانے کے لئے روتے۔ آنے کے وقت اس لئے روتے کہ شیرینی کی تقسیم خاطر خواہ نہیں

ہوئی۔ بوڑھی ٹھکرائن بچوں کو پھسلاتی تھیں۔ اور بیچ بیچ میں اپنی بہوؤں کو سمجھاتی تھیں۔ دیکھو خبردار! جب تک گرہ نہ ہو جائے گھر سے باہر نہ نکلنا۔ ہنسیا۔ چھری۔ کلہاڑی انہیں ہاتھ سے مت چھونا۔ سمجھائے دیتی ہیں۔ ماننا چاہے نہ ماننا۔ تمہیں میری بات کی کون پرواہ ہے۔ منہ میں پانی کی بوند نہ پڑے۔ نارائن کے گھر بپت پڑی ہے۔ جو سادھو بھکاری دروازے پر آجائے۔ اسے پھیرنا مت۔ بہوؤں نے سنا۔ اور نہیں سنا۔ وہ منا رہی تھیں۔ کہ کسی طرح یہ یہاں سے ٹلیں۔ پھاگن کا مہینہ ہے۔ گانے کو ترس گئے۔ آج خوب گانا بجانا ہوگا۔

ٹھاکر صاحب تھے تو بوڑھے لیکن ضعف کا اثر دل تک نہیں پہنچا تھا۔ انہیں اس بات کا گھمنڈ تھا۔ کہ کوئی گہن بغیر گنگا اشنان کے نہیں چھوٹا۔ اُن کی علمی قابلیت حیرت انگیز تھی۔ صرف پتروں کو دیکھ کر مہینوں پہلے سورج گرہن اور دوسری تقریبوں کے دن بتا دیتے تھے۔ اس لئے گاؤں والوں کی نگاہ میں اُن کی عزت اگر پنڈتوں سے زیادہ نہ تھی۔ تو کم بھی نہ تھی۔ جوانی میں کچھ دنوں فوجی ملازمت بھی کی تھی۔ اُس کی گرمی اب تک باقی تھی۔ مجال نہ تھی۔ کہ کوئی ان کی طرف ترچھی آنکھ سے دیکھ سکے۔ ایک مذکوری

چپراسی کو ایسی عملی تنبیہ کی تھی۔ جس کی نظیر قرب وجوار کے دس پانچ
گاؤں میں بھی نہیں مل سکتی + ہمّت اور حوصلہ کے کاموں میں اب
بھی پیش قدمی کر جاتے تھے۔ کسی کام کو مشکل بنا دینا۔ ان کی ہمّت
کو تحریک دینا تھا۔ جہاں سب کی زبانیں بند ہو جائیں۔ وہاں وہ
شیروں کی طرح گرجتے تھے۔ جب کبھی گاؤں میں داروغہ جی تشریف
لاتے۔ تو ٹھاکر صاحب ہی کا دل گردہ تھا۔ کہ اُن سے آنکھیں ملا کر
دو بدو بات کر سکیں۔ عالمانہ مباحثہ کے میدان میں بھی اُن کے کارنامے
کچھ کم شاندار نہ تھے۔ جھگڑا پنڈت ہمیشہ اُن سے منہ چھپایا کرتے۔
غرض ٹھاکر صاحب کی جبلّی رعونت اور اعتماد نفس اُنہیں ہر برات
میں دولھا بننے پر مجبور کر دیتی تھی۔ ہاں کمزوری اتنی تھی۔ کہ اپنی
آلھا بھی آپ ہی گا لیتے۔ اور مزے لے لے کر۔ کیونکہ تصنیف،
مصنّف ہی خوب بیان کرتا ہے +

(۳)

جب دوپہر ہوتے ہوتے ٹھاکر اور ٹھکرائن گاؤں سے چلے۔
تو سیکڑوں آدمی اُن کے ساتھ تھے۔ اور پختہ سڑک پر پہنچے۔ تو
جاتریوں کا ایسا تانتا لگا ہوا تھا۔ گویا کوئی بازار ہے۔ ایسے ایسے بڈھے
لاٹھیاں ٹیکتے یا ڈولیوں پر سوار چلے جاتے تھے۔ جنہیں جیتے

دینے کی ملک الموت نے بھی کوئی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ اندھے دوسروں کی لکڑی کے سہارے قدم بڑھائے آتے تھے۔ بعض آدمیوں نے اپنی بوڑھی ماتاؤں کو پیٹھ پر لاد لیا تھا۔ کسی کے سر پر کپڑوں کا بقچہ۔ کسی کے کندھے پر لوٹا ڈور کسی کے کندھے پر کانوڑ۔ کتنے ہی آدمیوں نے پیروں پر چیتھڑے لپیٹ لئے تھے۔ جوتے کہاں سے لائیں۔ مگر مذہبی جوش کی یہ برکت تھی۔ کہ من کسی کا میلا نہ تھا۔ سب کے چہرے شگفتہ ہنستے باتیں کرتے سرگرم رفتار تھے۔ کچھ عورتیں گا رہی تھیں۔

چاند سورج دونوں لوک کے مالک۔ ایک دنا ن انہوں پر بنتی

ہم جانی ہم ہی پر بنتی

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ یہ آدمیوں کی ایک ندی تھی جو سیکڑوں چھوٹے چھوٹے نالوں اور دھاروں کو لیتی ہوئی سمندر سے ملنے کے لئے جا رہی تھی۔

جب یہ لوگ گنگا کے کنارے پہنچے۔ تو سہ پہر کا وقت تھا لیکن میلوں تک کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ اس شاندار نظارہ سے دلوں پر رعب اور احترام کا ایسا رعب ہوتا تھا۔ کہ بے اختیار "گنگا ماتا کی جے" کی صدائیں بلند ہو جاتی تھیں۔ لوگوں کے اعتقاد

اُسی ندی کی طرح اُمڈے ہوئے تھے۔ اور وہ ندی! وہ لہراتا ہوا نیل زار! وہ تشنہ کاموں کی پیاس بجھانے والی! وہ نامرادوں کی آس۔ وہ برکتوں کی دیوی۔ وہ پاکیزگی کا سرچشمہ۔ وہ مشتِ خاک کو پناہ دینے والی گنگا ہنستی تھی۔ مسکراتی تھی۔ اور اُچھلتی تھی۔ کیا اس لئے کہ آج وہ اپنی عامِ عزت پر پھولی نہ سماتی تھی! یا اس لئے کہ وہ اُچھل اچھل کر اپنے پریمیوں سے گلے ملنا چاہتی تھی۔ جو اُس کے درشنوں کے لئے منزلیں طے کر کے آئے تھے۔ اور اُس کے لباس کی تعریف کس زبان سے ہو۔ جس پر آفتاب نے درخشاں تارے ٹانکے تھے۔ اور جس کے کناروں کو اس کی کرنوں نے رنگ برنگ خوشنما اور متحرک پھولوں سے سجایا تھا۔

ابھی گہن لگنے میں گھنٹوں کی دیر تھی۔ لوگ ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ کہیں مداریوں کے شعبدے تھے۔ کہیں چورن والے کی شیوہ بیانیوں کے معجزے۔ کچھ لوگ مینڈھوں کی کشتی دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ ٹھاکر صاحب بھی اپنے چند معتقدوں کے ساتھ سیر کو نکلے۔ ان کی علو ہمتی نے گوارا نہ کیا۔ کہ ان عامیانہ دلچسپیوں میں شریک ہوں۔ یکایک انہیں ایک وسیع شامیانہ تنا ہوا نظر آیا۔ جہاں زیادہ تر تعلیم یافتہ آدمیوں کا مجمع تھا۔ ٹھاکر صاحب

نے اپنے ساتھیوں کو ایک کنارے کھڑا کر دیا۔ اور خود ایک مغرورانہ انداز سے تاکتے ہوئے فرش پر جا بیٹھے کیونکہ انہیں یقین تھا۔ کہ یہاں ان پر دہقانیوں کی نگاہ رشک پڑے گی۔ اور ممکن ہے۔ ایسے نکتے بھی معلوم ہو جائیں۔ جو معتقدین کو اُن کی ہمہ دانی کا یقین دلانے میں کام دے سکیں۔

یہ ایک اخلاقی جلسہ تھا۔ دو ڈھائی ہزار آدمی بیٹھے ہوئے ایک شیریں بیان مقرر کی تقریر سُن رہے تھے۔ فیشنبل لوگ زیادہ تر اگلی صفوں میں جلوہ افروز تھے۔ جنہیں سرگوشیوں کا اس سے بہتر موقعہ نہیں مل سکتا تھا۔ کتنے ہی خوش پوش حضرات اس لئے مکدر نظر آتے تھے۔ کہ اُن کی بغل میں کمتر درجہ کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ تقریر بظاہر دلچسپ تھی۔ وزن زیادہ تھا۔ اور چٹخارے کم۔ اس لئے تالیاں نہیں بجتی تھیں۔

(۲)

حضرت واعظ نے دوران تقریر میں فرمایا:۔

میرے پیارے دوستو! یہ ہمارا اور آپ کا فرض ہے۔ اس سے زیادہ اہم۔ زیادہ نتیجہ خیز۔ اور قوم کے لئے زیادہ مبارک اور کوئی فرض نہیں ہے۔ ہم مانتے ہیں۔ کہ اُن کے عادات اور اخلاق

کی حالت نہایت افسوس ناک ہے۔ مگر یقین مانئیے یہ سب ہماری کرنی ہے۔ ان کی اس شرمناک تمدنی حالت کا ذمہ وار ہمارے سوا اَور کون ہو سکتا ہے؟ اب اس کے سوا اس کا اور کوئی علاج نہیں ہے۔ کہ ہم اُس نفرت اور حقارت کو جو ان کی طرف سے ہمارے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے۔ دھوئیں اور خوب مل کر دھوئیں۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔ جو سیاہی کئی ہزار برسوں سے جمی ہوئی ہے۔ وہ آسانی سے نہیں مٹ سکتی۔ جن لوگوں کے سائے سے ہم پرہیز کرتے آئے ہیں۔ جنہیں ہم نے حیوانوں سے بھی ذلیل سمجھ رکھا ہے۔ اُن سے گلے ملنے میں ہم کو ایثار۔ ہمت اور بے نفسی سے کام لینا پڑے گا۔ اس ایثار سے جو کرشن میں تھا۔ اُس ہمت سے جو رام میں تھی۔ اس بے نفسی سے جو چیتن اور گووند میں تھی میں یہ نہیں کہتا۔ کہ آپ آج ہی اُن سے شادی کے رشتے جوڑیں۔ یا اُن کے نوالہ و پیالہ میں شریک ہوں۔ مگر کیا یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ کہ آپ اُن کے ساتھ عام ہمدردی۔ عام انسانیت۔ عام اخلاق سے پیش آئیں؟ کیا یہ واقعی غیر ممکن امر ہے۔ آپ نے کبھی عیسائی مشنریوں کو دیکھا ہے؟ آہ! جب میں ایک اعلے درجے کی حسین۔ نازک اندام۔ سیمتن لیڈی کو اپنی گود میں ایک

سیہ فام بچہ لئے ہوئے دیکھتا ہوں جس کے بدن پر پھوڑے ہیں خون ہے۔ اور غلاظت ہے۔ وہ نازنین اس بچے کو چومتی ہے پیار کرتی ہے چھاتی سے لگاتی ہے۔ تو میرا جی چاہتا ہے۔ کہ اس دیوی کے قدموں پر سر رکھ دوں۔ اپنا بچاپن اپنی فرومائگی۔ اپنی چھوٹی بڑائی۔ اپنی تنگ نظری مجھے کبھی اتنی صفائی سے نظر نہیں آتی! ان دیویوں کے لئے زندگی میں کیا کیا نعمتیں نہیں تھیں خوشیاں آغوش کھولے ہوئے ان کی منتظر کھڑی تھیں۔ ان کے لئے دولت کی تن آسانیاں تھیں۔ محبت کی پر لطف دلاویزیاں تھیں۔ اپنے یگانوں اور عزیزوں کی ہمدردیاں تھیں۔ اور اپنے پیارے وطن کی کشش تھی۔ لیکن ان دیویوں نے ان تمام نعمتوں۔ ان تمام دنیوی برکتوں کو خدمت۔ سچی بیغرض خدمت پر قربان کر دیا ہے! وہ ایسی ملکوتی قربانیاں کر سکتی ہیں۔ کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ کہ اپنے اچھوت بھائیوں سے ہمدردی کا سلوک کر سکیں؟ کیا ہم واقعی ایسے پست ہمت۔ ایسے بودے۔ ایسے بیرحم ہیں؟ اسے خوب سمجھ لیجئے۔ کہ آپ ان کے ساتھ کوئی رعایت۔ کوئی مہربانی نہیں کر رہے ہیں۔ یہ ان پر کوئی احسان نہیں ہے۔ یہ آپ ہی کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس لئے میرے بھائیو۔ اور دوستو! آیئے۔ اس موقع پر شام کے وقت پونڈ

گنگا جی کے کنارے۔ کاشی کے پوتّر استھان میں ہم مضبوط د
عہد کریں۔ کہ آج سے ہم اچھوتوں کے ساتھ برادرانہ سلوک کری
اُن کی تقریبوں میں شریک ہوں گے۔ اور اپنی تقریبوں میں
بُلائیں گے۔ اُن کے گلے ملیں گے۔ اور انہیں اپنے گلے لگا
اُن کی خوشیوں میں خوش اور ان کے دردوں میں دردمند ہو
اور چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ چاہے طعنہ و تضحیک ا
سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ہم اس عہد پر قائم رہیں گے
ہیں صدہا پُرجوش نوجوان ہیں۔ جو بات کے دھنی اور ارا
مضبوط ہیں۔ کون یہ عہد کرتا ہے۔ کون اپنی اخلاقی دلیری کا
دیتا ہے۔ جو وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو جائے۔ اور للکار کر کہے۔ کہ میں
کرتا ہوں۔ اور مرتے دم تک اس پر قائم اور ثابت قدم رہوں

(۴)

آفتاب گنگا کی گود میں جا بیٹھا تھا۔ اور یہاں محبت او
متوالی۔ جوش سے اُڑی ہوئی رنگ میں کیسر کو شرماتی اور
سونے کو لجاتی تھی۔ چاروں طرف ایک رعب افزا خاموشی
تھی۔ اس سنّاٹے میں سنیاسی کی گرمی اور حرارت سے بھ
باتیں گنگا کی لہروں اور آسمان سے سر ٹکرانے والے منـ...

میں سما گئیں۔ گنگا ایک متین مادرانہ مایوسی کے ساتھ ہنسی اور دیوتاؤں نے افسوس سے سر جھکا لیا۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولے ؛

سنیاسی کی صدا اُٹھے بلند فضا میں جا کر غائب ہو گئی۔ مگر اس مجمع میں کسی شخص کے دل تک نہ پہنچی۔ وہاں قومی فدائیوں کی کمی نہ تھی اسٹیجوں پر قومی تماشے کھیلنے والے کالجوں کے ہونہار نوجوان۔ قوم کے نام پر مٹنے والے اخبار نویس۔ قومی جماعتوں کے ممبر، سکرٹری اور پریسیڈنٹ۔ رام اور کرشن کے سامنے سر جھکانے والے سیٹھ اور ساہوکار قومی کالجوں کے عالی حوصلہ پروفیسر اور اخباروں میں قومی ترقیوں کی خبریں پڑھ کر خوش ہونے والے دفتروں کے کارکن۔ ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ آنکھوں پر سنہری عینکیں لگائے فربہ اندام اور خوش وضع وکیلوں کی ایک پوری فوج آراستہ تھی۔ مگر سنیاسی کی اُس آتشیں تقریر پر ایک دل بھی نہ پگھلا۔ کیونکہ وہ پتھر کے دل تھے جن میں درد و گداز نہ تھا۔ جن میں خواہش تھی۔ مگر عمل نہ تھا۔ جن میں بچوں کی سی خواہش تھی۔ مگر مردوں کا سا ارادہ نہ تھا ؛

ساری مجلس پر سکوت کا عالم طاری تھا۔ ہر شخص سر جھکائے فکر میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔ ندامت کسی کو سر اُٹھانے نہ دیتی تھی۔ اور آنکھیں خفت سے زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہی سر

ہیں جو قومی چرچوں پر اُچھل پڑتے تھے - یہ وہی آنکھیں ہیں - جو
کسی وقت قومی غرور کی سُرخی سے لبریز ہو جاتی تھیں - مگر قول اور
فعل میں آغاز اور انجام کا فرق ہے - ایک فرد کو بھی کھڑے ہونے
کی جرأت نہ ہوئی - مقراض کی طرح چلنے والی زبانیں بھی ایسی
عظیم الشان ذمہ واری کے خوف سے بند ہو گئیں ؛

(۵)

ٹھاکر درشن سنگھ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے اس نظارہ کو بہت
غور اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے - وہ اپنے مذہبی عقائد میں چاہے
راسخ ہوں یا نہ ہوں لیکن تمدنی معاملات میں وہ کبھی پیش قدمی کے
خطاوار نہیں ہوئے تھے - اس پیچیدہ اور وحشت ناک راستے میں
اُنہیں اپنی عقل و تمیز اور ادراک پر بھی بھروسہ نہیں ہوتا تھا - یہاں
منطق اور استدلال کو بھی اُن سے ہار ماننی پڑتی تھی - اس میدان
میں وہ اپنے گھر کی مستورات کی تعمیل کرنا ہی اپنا فرض سمجھتے تھے
اور چاہے انہیں ذاتاً کسی معاملہ میں کچھ اعتراض بھی ہو - لیکن یہ
نسوانی معاملہ تھا - اور اس میں وہ مداخلت نہیں کر سکتے تھے - کیونکہ
اس سے خاندانی نظام میں شورش اور تلاطم پیدا ہو جانے کا زبردست
احتمال رہتا تھا - اگر کسی وقت اُن کے بعض سرگرم نوجوان دوست

اس کمزوری پر اُنہیں آڑے ہاتھوں لیتے تو وہ بہت دانش مندی سے کہا کرتے تھے۔ بھئی یہ عورتوں کے معاملے ہیں۔ اُن کا جیسا دل چاہتا ہے۔ کرتی ہیں۔ مَیں بولنے والا کون ہوں۔ غرض یہاں اُن کی فوجی گرم مزاجی ان کا ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔ یہ اُن کے لئے وادیٔ طلسم تھی۔ جہاں ہوش و حواس مسخ ہو جاتے تھے۔ اور کورانہ تقلید کا پیر تسمہ پا گردن پر سوار ہو جاتا تھا۔

لیکن یہ للکار سُن کر وہ اپنے تئیں قابو میں نہ رکھ سکے۔ یہی وہ موقع تھا۔ جب اُن کی ہمتیں آسمان پر جا پہنچتی تھیں۔ جس بیڑے کو کوئی نہ اٹھائے۔ اسے اٹھانا ان کا کام تھا۔ انتزاع سے انہیں روحانی مناسبت تھی۔ ایسے موقع پر وہ نتیجہ اور مصلحت سے بغاوت کر جاتے تھے۔ اور اُن کے اس حوصلہ میں حرص شہرت کو اتنا دخل نہیں تھا۔ جتنا اپنے فطری میلان کو۔ ورنہ یہ غیر ممکن تھا۔ کہ ایک ایسے جلسے میں جہاں علم و تہذیب کی نمود تھی۔ جہاں طلائی عینکوں سے روشنی اور گوناگوں لباسوں سے فکر تاباں کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ جہاں وضع کی نفاست سے رُعب۔ اور فربہی و دبازت سے وقار کی جھلک آتی تھی۔ وہاں ایک دہقانی کسان کو زبان کھولنے کا حوصلہ ہوتا۹ ٹھاکر نے اس نظارے کو غور اور

دلچسپی سے دیکھا۔ اُس کے پہلو میں گدگدی سی ہوئی۔ زندہ دلی کا جوش رگوں میں دوڑا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور مردانہ لہجے میں للکار کر بولا۔ "میں یہ پرتگیا کرتا ہوں اور مرتے دم تک اس پر قائم رہوں گا۔"

(۹)

اتنا سُننا تھا۔ کہ دو ہزار آنکھیں انداز تحیر سے اُس کی طرف تاکنے لگیں سبحان اللہ کیا وضع تھی۔ گاڑھے کی ڈھیلی مرزائی۔ گھٹنوں تک چڑھی ہوئی دھوتی۔ سر پر ایک گرانبار اُلجھا ہوا صافہ۔ کندھے پر چنوتی اور تمباکو کا وزنی بٹوا۔ مگر بشرے سے متانت اور استقلال نمایاں تھا۔ غرور آنکھوں کے تنگ ظرف سے باہر نکلا پڑتا تھا۔ اس کے دل میں اب اس شاندار مجمع کی عزت باقی نہ رہی تھی۔ وہ پُرانے وقتوں کا آدمی تھا۔ جو اگر پتھر کو پوجتا تھا۔ تو اسی پتھر سے ڈرتا بھی تھا جس کے لیے اکادشی کا برت محض حفظ صحت کی ایک تدبیر اور گنگا محض صحت بخش پانی کا ذخیرہ نہ تھی۔ اُس کے عقیدے میں بیدار مغزی نہ ہو لیکن تشکک نہیں تھے غرض اس کا اخلاق پابند عمل تھا۔ اور اس کی بنیاد کچھ تقلید اور معاوضے پر تھی۔ مگر زیادہ تر خوف پر۔ جو نور عرفاں کے بعد تہذیب نفس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ گیروے بانے کی عزت و احترام کرنا۔ اُس کے مذہب اور ایمان کا ایک جزو تھا۔ سنیاس میں اس کی روح کو اپنا فرماں گزار

بنانے کی ایک زندہ طاقت چھپی ہوئی تھی۔ اور اس طاقت نے اپنا اثر دکھایا
لیکن مجمع کی اس حیرت نے بہت جلد تمسخر کی صورت اختیار کی۔ پرمعنی نگاہیں
آپس میں کہنے لگیں۔ آخر گنواری تو ٹھہرا۔ دہقانی ہے کبھی ایسی تقریریں
کاہے کو سنی ہوں گی۔ بس اُبل پڑا۔ او تھلے گڈھے میں اتنا پانی بھی نہ سما
سکا۔ کون نہیں جانتا۔ کہ ایسی تقریروں کا منشا تفریح ہوتا ہے۔ دس
آدمی آ گئے۔ اکٹھے بیٹھے۔ کچھ سُنا۔ کچھ گپ شپ ماری۔ اور اپنے اپنے
گھر لوٹے۔ نہ یہ کہ قول قرار کرنے بیٹھیں۔ عمل کرنے کے لئے قسمیں کھائیں۔

مگر مایوس اور دل گرفتہ سنیاسی سوچ رہا تھا۔ افسوس! جس ملک
کی روشنی میں اتنا اندھیرا ہے۔ وہاں کبھی روشنی کا ظہور ہونا مشکل نظر آتا
ہے۔ اس روشنی پر۔ اس اندھیری۔ مُردہ اور بیجان روشنی پر میں جہالت
کو ترجیح دیتا ہوں۔ جہالت میں صفائی ہے اور ہمت ہے۔ اس کے دل
اور زبان میں پردہ نہیں ہوتا۔ نہ قول اور فعل میں اختلاف۔ کیا یہ افسوس
کی بات نہیں ہے۔ کہ علم جہالت کے سامنے سر جھکائے۔ اس سارے
مجمع میں صرف ایک شخص ہے جس کے پہلو میں مردوں کا دل ہے۔ اور گو
اُسے بیدار مغزی کا دعویٰ نہیں۔ لیکن میں اس کی جہالت پر ایسی ہزاروں
بیدار مغزیوں کو قربان کر سکتا ہوں۔ تب وہ پلیٹ فارم سے نیچے اترے
اور درشن سنگھ کو گلے سے لگا کر کہا۔ "ایشور تمہیں پرتگیا پر قائم رکھے"۔

(۱)

ناگ پنچمی آئی۔ ساٹھے کے زندہ دل نوجوانوں نے خوش رنگ جانگھیے بنوا لئے۔ اکھاڑے میں ڈھول کی مردانہ صدائیں بلند ہوئیں۔ قرب وجوار کے زور آزما اکٹھے ہوئے۔ اور اکھاڑے پر تمبولیوں نے اپنی دکانیں سجائیں۔ کیونکہ آج زور آزمائی اور دوستانہ مقابلے کا دن ہے۔ عورتوں نے گوبر سے اپنے آنگن لیپے۔ اور گاتی بجاتی کٹوروں میں دودھ چاول لئے ناگ پوجنے چلیں۔

ساٹھے اور پاٹھے دو ملحق موضع تھے۔ دونوں گنگا کے کنارے۔ زراعت میں زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اسی لئے آپس میں فوجداریوں کی گرم بازاری تھی۔ ازل سے اُن کے درمیان رقابت چلی آتی تھی۔ ساٹھے والوں کو یہ زعم تھا کہ انہوں نے پاٹھے

والوں کو کبھی سر نہ اٹھانے دیا۔ علیٰ ہذا پاٹھے والے اپنے رقیبوں کو زک دینا ہی زندگی کا مقدم کام سمجھتے تھے۔ اُن کی تاریخ فتوحات کی روایتوں سے بھری ہوئی تھی۔ پاٹھے کے چرواہے یہ گیت گاتے ہوئے چلتے تھے:

ساٹھے والے کاہ پُرسگرے۔ پاٹھے والے ہیں سردار

اور ساٹھے کے دھوبی گاتے:

ساٹھے والے ساٹھ ہاتھ کے۔ جن کے ہاتھ سدا تزوار

اُن لوگن کے جنم نسائے۔ جن پاٹھے مان لین اوتار

غرض رقابت کا یہ جوش بچّوں میں ماں کے ساتھ داخل ہوتا تھا۔ اور اس کے اظہار کا سب سے موزوں اور تاریخی موقع یہی ناگ پنچمی کا دن تھا۔ اس دن کے لیے سال بھر تیاریاں ہوتی رہتی تھیں۔ آج اُن میں معرکے کی کُشتی ہونے والی تھی۔ ساٹھے کو گوپال پر ناز تھا۔ پاٹھے کو بلدیو کا غرّہ۔ دونوں سورما اپنے اپنے فریق کی دعائیں اور آرزوئیں لیے ہوئے اکھاڑے میں اُترے۔ تماشائیوں پر مرکزی کشش کا اثر ہوا۔ موضع کے چوکیداروں نے لٹھ اور ڈنڈوں کا یہ جمگھٹ دیکھا۔ اور مردوں کی انگارے کی طرح لال آنکھیں۔ تو تجربہ سابقہ کی بنا پر بے پتہ ہو گئے۔ ادھر

اکھاڑے میں داؤں پیچ ہوتے رہے۔ بلدیو اُلجھتا تھا۔ گوپال پینترے بدلتا تھا۔ اُسے اپنی طاقت کا زعم تھا۔ اسے اپنے کرتب کا بھروسہ کچھ دیر تک اکھاڑے سے خم ٹھونکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ تب یکایک بہت سے آدمی خوشی سے نعرے مار مار اُچھلنے لگے۔ کپڑے اور برتن اور پیسے اور بتاسے لٹائے جانے لگے۔ کسی نے اپنا پرانا ساقہ پھینکا۔ کسی نے اپنی بوسیدہ ٹوپی ہوا میں اُڑا دی۔ سانٹھے کے منچلے جوان اکھاڑے میں پل پڑے۔ اور گوپال کو گود میں اُٹھا لائے۔ بلدیو اور اس کے رقیبوں نے گوپال کو لہو کی آنکھوں سے دیکھا۔ اور دانت پیس کر رہ گئے۔

(۲)

دس بجے رات کا وقت اور ساون کا مہینہ۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ تاریکی کا یہ عالم تھا۔ گویا روشنی کا وجود ہی نہیں رہا۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تھی۔ مگر تاریکی کو اور زیادہ تاریک کرنے کے لئے۔ مینڈکوں کی آواز زندگی کا پتہ دیتی تھی۔ ورنہ چاروں طرف موت تھی۔ خاموش خوفناک اور منحوس سانٹھے کے جھونپڑے اور مکانات اس اندھیرے میں بہت غور سے دیکھنے پر کالی کالی بھیڑوں کی طرح نظر آتے تھے۔ نہ بچے روتے تھے۔ نہ عورتیں گاتی تھیں۔ پیران

پار سارام نام بھی نہ جیتے تھے ❖
مگر آبادی سے بہت دور کئی پُرشور نالوں اور ڈھاک کے جنگلوں سے گزر کر جوار اور باجرے کے کھیت تھے۔ اور اُن کی مینڈوں پر ساٹھے کے کسان۔ جا بجا منڈیا ڈالے ہوئے کھیتوں کی رکھوالی کر رہے تھے تلے زمین۔ اوپر تاریکی۔ میلوں تک سناٹا چھایا ہوا۔ کہیں جنگلی سؤروں کے غول۔ کہیں نیل گایوں کے ریوڑ۔ چلم کے سوا کوئی ساتھی نہیں۔ آگ کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ ذرا کھٹکا ہوا۔ اور چونک پڑے۔ تاریکی خوف کا دوسرا نام ہے۔ جب ایک مٹی کا ڈھیر۔ ایک ٹھونٹھا درخت اور ایک تودہ کاہ بھی متحرک اور حساس بن جاتے ہیں۔ تاریکی ان میں جان ڈال دیتی ہے لیکن یہ مضبوط ہاتھوں والے مضبوط جگر والے مضبوط ارادے والے کسان ہیں۔ کہ یہ سب سختیاں جھیلتے ہیں تاکہ اپنے زیادہ خوش نصیب بھائیوں کے لئے عیش اور تکلف کے سامان بہم پہنچائیں۔ انہیں رکھوالوں میں آج کا ہیرو ساٹھے کا مایۂ ناز گوپال بھی ہے۔ جو اپنی مینڈیا میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور نیند کو بھگانے کے لئے دھیمے سُروں میں یہ نغمہ گا رہا ہے ❖

میں تو تو سے نینا لگائے پچھتائی رے

دفعتاً اُسے کسی کے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ جیسے ہرن

کتوں کی آوازوں کو کان لگا کر سنتا ہے۔ اسی طرح گوپال نے بھی کان لگا کر سُنا۔ نیند کی غنودگی دور ہو گئی۔ لٹھ کندھے پر رکھا۔ اور منڈیا سے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ وہ باہر نکلا ہی تھا۔ کہ اس کے سر پر لاٹھی کا بھرپور ہاتھ پڑا۔ وہ تیورا کر گرا۔ اور رات بھر وہیں بے سدھ پڑا رہا۔ معلوم نہیں۔ اس پر کتنی چوٹیں پڑیں۔ حملہ آوروں نے تو اپنی دانست میں اُس کا کام تمام کر ڈالا۔ لیکن حیات باقی تھی۔ یہ پاٹھے کے غیرت مند لوگ تھے۔ جنہوں نے اندھیرے کی آڑ میں اپنی ہار کا بدلہ لیا تھا۔

(۳)

گوپال ذات کا اہیر تھا۔ نہ پڑھا نہ لکھا۔ بالکل اکھڑ۔ دماغ روشن ہی نہیں ہوا۔ تو شمع جسم کیوں گھلتی۔ پورے چھ فٹ کا قد۔ گٹھا ہوا بدن للکار کر گاتا۔ تو سننے والے میل بھر پر بیٹھے ہوئے اس کی تانوں کا مزہ لیتے۔ گانے بجانے کا عاشق۔ ہولی کے دنوں میں مہینہ بھر تک گاتا۔ ساون میں ملار۔ اور بھجن تو روزمرّہ کا شغل تھا۔ نڈر ایسا کہ بھوت اور پشاچ کے وجود پر اُسے عالمانہ شکوک تھے۔ لیکن جس طرح شیر اور پلنگ بھی سُرخ شعلوں سے ڈرتے ہیں۔ اُسی طرح سُرخ

صافے سے اُس کی روح لرزاں ہو جاتی تھی۔ اگرچہ ساٹھے کے ایک
جوان ہمت سورما کے لئے یہ بے معنی خوف غیر معمولی بات تھی۔ لیکن
اس کا کچھ بس نہ تھا۔ سپاہی کی وہ خوفناک تصویر جو بچپن میں اُس کے
دل پر کھنچی گئی تھی نقش کالحجر بن گئی تھی۔ شرارتیں گئیں۔ بچپن گیا۔
مٹھائی کی بھوک گئی لیکن سپاہی کی تصویر ابھی تک قائم تھی۔ آج
اس کے دروازے پر سُرخ صافے والوں کی ایک فوج جمع تھی۔
لیکن گوپال زخموں سے چور۔ درد سے بیتاب ہونے پر بھی اپنے مکان
کے ایک تاریک گوشے میں چھپا ہُوا بیٹھا تھا۔ نمبردار اور مکھیا۔
پٹواری اور چوکیدار مرعوب انداز سے کھڑے داروغہ کی خوشامد کر رہے
تھے۔ کہیں اہیر کی داد فریاد سنائی دیتی تھی۔ کہیں موری کی گریہ و
زاری۔ کہیں تیلی کی چیخ پکار۔ کہیں قصاب کی آنکھوں سے لوجاری تھی
کلار کھڑا اپنی قسمتوں کو رو رہا تھا۔ فحش اور مغلظات کی گرم بازاری
تھی۔ داروغہ جی نہایت کارگزار افسر تھے۔ گالیوں سے بات
کرتے تھے۔ صبح کو چارپائی سے اُٹھتے ہی گالیوں کا وظیفہ پڑھتے
مہتر نے آکر فریاد کی " ہجے راندے نہیں ہیں "۔
داروغہ جی ہنٹر لے کر دوڑے۔ اور اس غریب کا ٹھیکرا نکال
دیا۔ سارے گاؤں میں ہلچل پڑی ہوئی تھی۔ کانسٹیبل اور چوکیدار

راستوں پر یوں اکڑتے چلتے تھے۔ گویا اپنی سسرال میں آئے ہیں۔ جب گاؤں کے سارے آدمی آ گئے۔ تو داروغہ جی نے افسرانہ انداز تحکم سے فرمایا "موضع میں ایسی سنگین واردات ہوئی۔ اور اس بدقسمت گوپال نے رپٹ تک نہ کی"۔

مکھیا صاحب بید لرزاں کی طرح کانپتے ہوئے بولے "ہجور اب ما پھی دی جائے"۔

داروغہ جی نے غضبناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا "یہ اس کی شرارت ہے۔ دنیا جانتی ہے۔ کہ اخفاء جرم ارتکاب جرم کے برابر ہے۔ میں اس بدمعاش کو اس کا مزہ چکھا دوں گا۔ وہ اپنی طاقت کے زعم میں پھولا ہوا ہے۔ اور کوئی بات نہیں۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے"۔

مکھیا صاحب سربسجود ہو کر بولے "ہجور اب ماپھی دی جائے"۔

داروغہ جی چیں بہ جبیں ہو گئے۔ اور جھنجھلا کر بولے "ارے ہجور کے بچے! کچھ سٹھیا تو نہیں گیا ہے۔ اگر اسی طرح معافی دینی ہوتی۔ تو مجھے کیا کتے نے کاٹا تھا۔ کہ یہاں تک دوڑا آتا۔ نہ کوئی معاملہ نہ معاملے کی بات۔ بس معافی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ مجھے زیادہ فرصت نہیں ہے۔ میں نماز پڑھتا ہوں۔ جب تک تم اپنا صلاح

مشورہ کر لو۔ اور مجھے ہنسی خوشی رخصت کرو۔ ورنہ غوث خاں کو جانتے ہو۔ اُس کا مارا پانی بھی نہیں مانگتا"۔

داروغہ تقوٰی و طہارت کے بڑے پابند تھے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے۔ اور تیسوں روزے رکھتے۔ عیدوں میں دھوم دھام سے قربانیاں ہوتیں۔ اس سے زیادہ حسن ارادت کسی انسان میں اَور کیا ہو سکتا ہے؟

(۴)

مکھیا صاحب دبے پاؤں رازدارانہ انداز سے گورا کے پاس آئے۔ اور بولے "یہ دروگا بڑا کا پھر ہے۔ پچاس سے نیچے تو بات ہی نہیں کرتا۔ درجہ اوّل کا تھانہ دار ہے۔ میں نے بہت کہا۔ ہجور غریب آدمی ہے۔ گھر میں کچھ سُجھیتا نہیں۔ مگر وہ ایک نہیں سُنتا"۔

گورا نے گھونگھٹ میں منہ چھپا کر کہا "دادا ان کی جان بچ جائے کوئی طرح کی آنچ نہ آنے پائے۔ روپے پیسے کی کون بات ہے اسی دن کے لئے تو کمایا جاتا ہے"۔

گوپال کھاٹ پر پڑا یہ سب باتیں سُن رہا تھا۔ اب اُس سے ضبط نہ ہو سکا۔ لکڑی گانٹھ ہی پر ٹوٹتی ہے۔ ناکردہ گناہ دبتا ہے مگر کچلا نہیں جا سکتا۔ وہ جوش سے اٹھ بیٹھا۔ اور بولا "پچاس روپیہ

کی کون کہے۔ مَیں پچاس کوڑیاں بھی نہ دوں گا۔ کوئی گدر (غدر) ہَے۔ مَیں نے کسور (قصور) کیا کیا ہے"۔

مکھیا کا چہرہ فق ہو گیا۔ بزرگانہ لہجے میں بولے۔ "رساں رساں (آہستہ آہستہ) بولو۔ کہیں سُن لے تو گجب ہو جائے"۔

لیکن گوپال بپھرا ہُوا تھا۔ اکڑ کر بولا "مَیں ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔ دیکھیں کون میرے پھانسی لگا دیتا ہے"۔

گورا نے ملامت آمیز لہجے میں کہا "اچھا۔ جب مَیں تم سے روپے مانگوں تو مت دینا"۔ یہ کہہ کر گورا نے جو اس وقت لونڈی کے بجائے رانی بنی ہوئی تھی۔ چھپّر کے ایک کونے میں سے روپیوں کی ایک پوٹلی نکالی۔ اور مکھیا کے ہاتھ میں رکھ دی۔ گوپال دانت پیس کر اٹھا۔ لیکن مکھیا صاحب فوراً سے پہلے سرک گئے۔ داروغہ جی نے گوپال کی باتیں سُن لی تھیں۔ اور دُعا کر رہے تھے۔ کہ اے خدا اس مردود شقی کی تالیف قلب کر۔ اتنے میں مکھیا نے باہر آ کر پچیس روپے کی پوٹلی دکھائی۔ پچیس راستے ہی میں غائب ہو گئے تھے۔ داروغہ جی نے خدا کا شکر کیا۔ دُعا مستجاب ہوئی۔ روپیہ جیب میں رکھا۔ اور رسد پہنچانے والوں کے انبوہ کثیر کو روتے اور بلبلاتے چھوڑ کر ہوا ہو گئے۔ مودی کا گلا گھٹ گیا۔ قصاب کے گلے پر چھری

پھر گئی۔ تیلی پس گیا۔ مکھیا صاحب نے گوپال کی گردن پر احسان رکھا گویا رسد کے دام گرہ سے دیئے۔ گاؤں میں سرخرو ہو گئے۔ وقار بڑھ گیا ادھر گوپال نے گورا کی خوب خبر لی۔ گاؤں میں رات بھر یہی چرچا رہا۔ گوپال بہت بچا۔ اور اس کا سہرا مکھیا کے سر تھا۔ بلائے عظیم آئی تھی۔ وہ ٹل گئی۔ پتروں نے۔ دیوان ہردول نے نیم تلے والی دیبی نے تالاب کے کنارے والی ستی نے گوپال کی رکھشا کی۔ یہ انہیں کا پرتاپ تھا۔ دیوی کی پوجا ہونی ضروری تھی ستیہ نارائن کی کتھا بھی لازمی ہو گئی ؂

(۵)

پھر صبح ہوئی۔ لیکن گوپال کے دروازے پر آج سرخ پگڑیوں کے بجائے لال ساڑیوں کا جمگھٹ تھا۔ گورا آج دیوی کی پوجا کرنے جاتی تھی۔ اور گاؤں کی عورتیں اس کا ساتھ دینے آئی تھیں۔ اس کا گھر سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ جو خس اور گلاب سے کم دلاویز نہ تھی۔ عورتیں سہانے گیت گا رہی تھیں۔ بچے خوش ہو ہو کر دوڑتے تھے۔ دیوی کے چبوترے پر اس نے مٹی کا ہاتھی چڑھایا۔ ستی کی مانگ میں سیندور ڈالا۔ دیوان صاحب کو بتاشے اور حلوا کھلایا۔ ہنومان جی کو لڈو سے زیادہ رغبت ہے۔

انہیں لڈو چڑھائے۔ تب گاؤں سجاتی گھر کو آئی۔ اور ستیہ نارائن کی کتھا کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مالن پھول کے ہار کیلے کی شاخیں اور بندھن واریں لائی۔ کمہار نئے نئے چراغ اور ہانڈیاں دے گیا۔ باری ہرے ڈھاک کے پتل اور دونے رکھ گیا۔ کہار نے آکر مٹکوں میں پانی بھرا۔ بڑھئی نے آکر گوپال اور گورا کے لئے دو نئی نئی پیڑھیاں بنائیں۔ نائن نے آنگن لیپا۔ اور چوک بنائی دروازے پر بندھن واریں بندھ گئیں۔ آنگن میں کیلے کی شاخیں گڑ گئیں پنڈت جی کے لئے سنگھاسن سج گیا۔ فرائض باہمی کا نظام خود بخود اپنے مقررہ دائرے پر چلنے لگا۔ یہی نظام تمدن ہے جس نے دیہات کی زندگی کو تکلفات سے بے نیاز بنا رکھا ہے لیکن افسوس ہے۔ کہ اب اونچے اور اعلےٰ کی بے معنی اور بیہودہ قیود نے ان باہمی فرائض کو امداد حسنہ کے رتبے سے ہٹا کر ان پر ذلت اور نیچے پن کا داغ لگا دیا ہے ۔

شام ہوئی۔ پنڈت موٹے رام جی نے کندھے پر جھولی ڈالی ہاتھ میں سنکھ لیا۔ اور کھڑاؤں پر کھٹ پٹ کرتے گوپال کے گھر آپہنچے۔ آنگن میں ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ گاؤں کے معززین کتھا سننے کے لئے آبیٹھے۔ گھنٹی بجی۔ سنکھ پھونکا گیا۔ اور کتھا شروع ہوئی

گوپال بھی گاڑھے کی چادر اوڑھے ایک کونے میں دیوار کے آسرے سے بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔ نمبردار اور پٹواری نے ازراہ ہمدردی اس سے کہا "ستیہ نارائن کی مہما تھی۔ کہ تم پر کوئی آنچ نہ آئی"۔ گوپال نے انگڑائی لے کر کہا "ستیہ نارائن کی مہما نہیں یہ اندھیر ہے پٹو"

بانکا زمیندار

(۱)

ٹھاکر پردُمن سنگھ ایک ممتاز وکیل تھے۔ اور اپنے حوصلہ و ہمت کے لئے سارے شہر میں مشہور۔ اُن کے اکثر احباب کہا کرتے تھے۔ کہ اجلاس عدالت میں ان کے مردانہ کمالات زیادہ نمایاں طور پر ظاہر ہوا کرتے ہیں اسی کی برکت تھی۔ کہ باوجود اس کے کہ انہیں شاذ ہی کسی معاملہ میں سُرخروئی حاصل ہوتی تھی۔ اُن کے موکلوں کے حُسن عقیدت میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آتا تھا۔ صدر انصاف پر جلوہ فرما ہونے والے بزرگوں کی۔ بے خوف آزادی پر کسی قسم کا شبہ کرنا کفر ہی کیوں نہ ہو۔ مگر شہر کے واقف کار لوگ علانیہ کہتے تھے۔ کہ ٹھاکر صاحب جب کسی معاملے میں ضد پکڑ لیتے ہیں۔ تو ان کا بدلا ہوا تیور۔ اور تمتمایا ہوا چہرہ انصاف کو بھی اپنا تابع فرمان بنا لیتے ہیں۔ ایک سے زیادہ موقعوں پر اُن کے

جیوٹ اور جگر نے وہ معجزے کر دکھائے تھے۔ جہاں انصاف و قانون نے جواب دے دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ٹھاکر صاحب مردانہ اوصاف کے سچے جوہر شناس تھے۔ اگر موکل کو فن زور آزمائی میں کچھ دسترس ہو تو یہ ضروری نہیں تھا۔ کہ وہ ان کی خدمات حاصل کرنے کے لئے مال و زر کا منت کش بنے۔ اسی لئے ان کے یہاں شہر کے پہلوانوں اور پھکیتوں کا ہمیشہ جمگھٹ رہتا تھا۔ اور یہی وہ زبردست۔ پرتاثیر اور عملی نکتہ قانون تھا جس کی تردید کرنے میں انصاف کو بھی تامل ہوتا تھا۔ وہ غرور۔ اور سچے غرور کی دل سے قدر کرتے تھے۔ ان کے خانہ بے تکلف کے آستانے بہت اونچے تھے۔ وہاں جھکنے کی ضرورت نہ تھی۔ انسان خوب سر اٹھا کر جا سکتا تھا۔ یہ معتبر روایت ہے۔ کہ ایک بار انہوں نے کسی مقدمہ کو باوجود بہت منت و اصرار کے ہاتھ میں لینے سے انکار کیا۔ موکل کوئی اکھڑ دہقانی تھا۔ اس نے جب منت سے کام نکلتے نہ دیکھا۔ تو ہمت سے کام لیا۔ وکیل صاحب کرسی سے نیچے گر پڑے۔ اور پھر سے ہوئے دہقانی کو سینے سے لگا لیا۔

(۲)

دولت کو زمین سے ازلی مناسبت ہے۔ زمین میں عام کشش کے سوا ایک خاص طاقت ہوتی ہے۔ جو ہمیشہ دولت کو اپنی طرف

کھینچتی ہے۔ سود۔ اور تمسک۔ اور تجارت یہ دولت کی درمیانی
منزلیں ہیں۔ زمین اس کی منزل مقصود ہے۔ ٹھاکر پودمن سنگھ
کی نگاہیں بہت عرصے سے ایک بہت زرخیز موضع پر لگی ہوئی تھیں۔
لیکن بینک کا اکاؤنٹ کبھی حوصلہ کو قدم نہیں بڑھانے دیتا تھا۔
یہاں تک کہ ایک دفعہ اُسی موضع کا زمیندار ایک قتل کے معاملہ میں
ماخوذ ہُوا۔ اُس نے صرف رسم و رواج کے موافق ایک اسامی کو دن
بھر دھوپ۔ اور جلیٹھ کی جلتی ہوئی دھوپ میں کھڑا رکھا تھا۔ لیکن
اگر آفتاب کی تمازت۔ یا جسمانی کمزوری یا پیاس کی شدت اس کی
جان لیوا بن جائے۔ تو اس میں زمیندار کی کیا خطا تھی؟ یہ وکلا شہر
کی زیادتی تھی۔ کہ کوئی اس کی حمایت پر آمادہ نہ ہُوا۔ یا ممکن ہے
زمیندار کی تہیدستی کو بھی اس میں کچھ دخل ہو۔ بہرحال اُس نے
چاروں طرف سے ٹھوکریں کھا کر ٹھاکر صاحب کی پناہ لی۔ مقدمہ
نہایت کمزور تھا۔ پولیس نے اپنی پوری طاقت سے دھاوا کیا تھا
اور اس کی کمک کے لیے حکومت اور اختیار کے تازہ دم رسالے
تیار تھے۔ ٹھاکر صاحب آزمودہ کار سپیروں کی طرح سانپ کے ماند
میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ لیکن اس موقع پر نہیں خشک مصلحت
کے مقابلہ میں اپنی مدعاؤں کا پلّہ جھکتا ہُوا نظر آیا۔ زمیندار کی تشفی

کی۔ اور وکالت نامہ داخل کر دیا۔ اور پھر ایسی جانفشانی سے مقدمہ کی پیروی کی۔ کچھ اس طرح جان لڑائی۔ کہ میدان سے فتح و نصرت کے شادیانے بجاتے ہوئے نکلے۔ بزبان خلق۔ اس فتح کا سہرا اُن کی قانونی دسترس کے سر نہیں۔ ان کے مردانہ اوصاف کے سر رکھتی ہے۔ کہ اُن دنوں وکیل صاحب نظائر و دفعات کی ہمت شکن پیچیدگیوں میں اُلجھنے کے بجائے دنگل کی حوصلہ بخش دلچسپیوں میں زیادہ منہمک رہتے تھے۔ لیکن یہ مطلق قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ زیادہ واقف کار لوگ کہتے ہیں۔ کہ انار کے بم گولوں۔ اور سیب و انگور کی گولیوں نے پولیس کے اس حملہ پرشور کو منتشر کر دیا۔ الغرض میدان ہمارے ٹھاکر صاحب کے ہاتھ رہا۔ زمیندار کی جان بچی۔ تو منت کے منہ سے نکل آیا۔ اُن کے پیروں پر گر پڑا۔ اور بولا۔ ٹھاکر صاحب میں اس قابل تو نہیں۔ کہ آپ کی خدمت کر سکوں۔ ایشور نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے۔ لیکن کرشن بھگوان نے غریب سُداما کے سوکھے چاول خوشی سے قبول کئے تھے۔ میرے پاس بزرگوں کی یادگار۔ ایک چھوٹا سا ویران موضع ہے۔ اُسے آپ کے نذر کرتا ہوں۔ آپ کے لائق تو نہیں۔ لیکن میری خاطر سے اسے قبول کیجئے۔ میں آپ کا جس کبھی نہ بھولوں گا۔ وکیل صاحب

پھڑک اُٹھے۔ دو چار بار عارفانہ انکار کے بعد اس نذر کو قبول کر لیا۔ منہ مانگی مراد بر آئی *

(۳)

اس موضع کے لوگ نہایت سرکش اور فتنہ پرداز تھے جنہیں اس بات کا فخر تھا۔ کہ کبھی کوئی زمیندار اُنہیں پابند عناں نہیں کر سکا۔ لیکن جب اُنہوں نے اپنی باگ ڈور رپودمن سنگھ کے ہاتھوں میں جاتے دیکھی۔ تو چوکڑیاں بھول گئے۔ ایک بدلگام گھوڑے کی طرح سوار کو کنکھیوں سے دیکھا۔ کنوتیاں کھڑی کیں۔ کچھ ہنہنائے۔ اور تب گردنیں جھکا دیں۔ سمجھ گئے۔ کہ یہ جگر کا مضبوط اور آسن کا پکا شہسوار ہے *

اساڑھ کا مہینہ تھا۔ کسان گہنے اور برتن بیچ بیچ کر بیلوں کی تلاش میں دربدر پھرتے تھے۔ گاؤں کی بوڑھی بنیائن نویلی دُلھن بنی ہوئی تھی۔ اور فاقہ کش کمہار بارات کا دولھا تھا۔ مزدور موقع کے بادشاہ بنے ہوتے تھے۔ ٹپکتی ہوئی چھتیں اُن کے نگاہ کرم کی منتظر۔ گھاس سے ڈھکے ہوئے کھیت اُن کے دست شفقت کے محتاج۔ جسے چاہتے تھے بساتے تھے۔ جسے چاہتے اجاڑتے تھے۔ آم اور جامن کے پیڑوں پر آٹھوں پہر نشانہ باز۔

منچلے لڑکوں کا محاصرہ رہتا تھا۔ بوڑھے۔ گردنوں میں جھولیاں لٹکائے
پھر رات سے ٹیکے کے کھوج میں گھومتے نظر آتے تھے۔ جو باوجود
پیرانہ سالی کے بھجن اور جاپ سے زیادہ دلچسپ اور پُرمزہ شغل
تھا۔ نالے پرشور۔ ندیاں اتھاہ چاروں طرف ہریالی اور سبزہ۔
اور نزہت کا حسن بسط۔ انہیں دنوں ٹھاکر صاحب مرگ بے ہنگام
کی طرح گاؤں میں آئے۔ ایک سجی ہوئی برات تھی۔ ہاتھی اور
گھوڑے اور ساز و سامان۔ لٹھیتوں کا ایک رسالہ ساتھ۔ گاؤں
کے لوگوں نے یہ طمطراق اور کر و فر دیکھا تو رہے سہے ہوش اُڑ
گئے۔ گھوڑے کھیتوں میں اینڈنے لگے۔ اور گنڈے گلیوں میں۔
شام کے وقت ٹھاکر صاحب نے اپنے اسامیوں کو بُلایا۔ اور تب
بہ آواز بلند بولے "مَیں نے سنا ہے۔ کہ تم لوگ بڑے سرکش ہو۔
اور میری سرکشی کا حال تم کو معلوم ہی ہے۔ اب اینٹ اور پتھر
کا سامنا ہے۔ بولو کیا منظور ہے؟"

ایک بوڑھے کسان نے بید لرزاں کی طرح کانپتے ہوئے
جواب دیا "سرکار آپ ہمارے راجہ ہیں۔ ہم آپ سے اینٹھ
کر کہاں جائیں گے"؟

ٹھاکر صاحب تیور بدل کر بولے "تم لوگ سب کے سب

کل صبح تک تین سال کا پیشگی لگان داخل کر دو۔ اور خوب دھیان دے کر سن لو کہ مَیں حکم کو دُہرانا نہیں جانتا۔ ورنہ میں گاؤں میں ہل چلوا دوں گا۔ اور گھروں کو کھیت بنا دوں گا۔" سارے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ تین سال کا پیشگی لگان۔ اور اتنی جلدی فراہم ہونا غیر ممکن تھا۔ رات اسی حیص بیص میں کٹی۔ ابھی تک منت وسماجت کی بر نفی تاثیر کی امید باقی تھی۔ صبح بہت انتظار کے بعد آئی۔ تو قیامت بن کر آئی۔ ایک طرف تو جبر و تشدّد اور ظلم وتحکم کے ہنگامے گرم تھے۔ دوسری طرف دیدۂ گریاں اور آہ سرد اور نالہ بیداد کے۔ غریب کسان اپنے بقچے لادے۔ بیکسانہ انداز سے تاکتے۔ آنکھوں میں التجا۔ بیوی بچّوں کو ساتھ لئے روتے بلکتے کسی نامعلوم دیار غربت کو چلے جاتے تھے۔ شام ہوئی۔ تو گاؤں شہر خموشاں بنا ہُوا تھا۔

(۴)

یہ خبریں بہت جلد چاروں طرف پھیل گئیں۔ لوگوں کو ٹھاکر صاحب کے انسان ہونے پر شکوک ہونے لگے۔ گاؤں ویران پڑا ہُوا تھا۔ کون اُسے آباد کرے۔ کس کے بچّے اُس کی گلیوں میں کھیلیں۔ کس کی عورتیں کنوؤں پر پانی بھریں! راہ چلنے

ہوئے مسافر تباہی کا یہ نظارہ آنکھوں سے دیکھتے اور افسوس کرتے +
نہیں معلوم بیچارے غریب زدوں پر کیا گزری - آہ! جو محنت کی کمائی
کھاتے - اور سر اٹھا کر چلتے تھے - اب دوسروں کی غلامی کر رہے
ہیں +

اس طرح ایک پورا سال گزر گیا - تب گاؤں کے نصیب
جاگے - زمین زرخیز تھی - مکانات موجود - رفتہ رفتہ ظلم کی یہ
داستان پھیکی پڑ گئی - منچلے کسانوں کی ہوسناک نگاہیں اس پر
پڑنے لگیں - بلا سے زمیندار ظالم ہے - جابر ہے - بیرحم ہے - ہم
اُسے منالیں گے - تین سال کی پیشگی لگان کا کیا ذکر - وہ جیسے
خوش ہوگا - خوش کریں گے! اُس کی گالیوں کو دعا سمجھیں گے -
اس کے جوتے اپنے سر آنکھوں پر رکھیں گے - وہ راجہ ہیں - ہم اُن
کے چاکر ہیں! زندگی کی کشمکش اور جنگ میں خودداری اور عزت کو
نباہنا کیسا مشکل کام ہے! دوسرا اساڑھ آیا تو وہ گاؤں پھر رشک
گلزار بنا ہوا تھا - بچے پھر اپنے دروازوں پر گھروندے بنانے لگے
مردوں کے بلند نغمے کھیتوں میں سنائی دئے - اور عورتوں کے سہانی
گیت چکیوں پر - زندگی کے دلفریب جلوے نظر آنے لگے +

سال بھر اور گزرا جب ربیع کی دوسری فصل آئی - تو سنہری

بالوں کو کھیتوں میں لہراتے دیکھ کر کسانوں کے دل لہرانے لگتے تھے۔ سال بھر کی افتادہ زمین نے سونا اُگل دیا تھا۔ عورتیں خوش تھیں۔ کہ اب کے نئے نئے گہنے بنوائیں گے۔ مرد خوش تھے۔ کہ اچھے اچھے بیل مول لیں گے۔ اور داروغہ جی کی مسرّت کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب نے یہ خوش آئند خبریں سنیں۔ اور دیہات کی سیر کو چلے۔ وہی تزک و احتشام۔ وہی لٹھیتوں کا رسالہ۔ وہی گنڈوں کی فوج! گاؤں والوں نے اُن کی خاطر و تعظیم کی تیاریاں کرنی شروع کیں۔ موٹے تازے بکروں کا ایک پورا گلہ چوپال کے دروازے پر باندھا۔ لکڑی کے انبار لگا دیئے۔ دودھ کے حوض بھر دیئے۔ ٹھاکر صاحب گاؤں کے مینڈے پر پہنچے۔ تو پورے ایک سو آدمی اُن کی پیشوائی کے لئے دست بستہ کھڑے تھے۔ لیکن پہلی چیز جس کی فرمائش ہوئی وہ لیمونیڈ اور برف تھا۔ اسامیوں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ یہ پانی کی بوتل اس وقت وہاں آبِ حیات کے داموں بک سکتا تھا۔ مگر بیچارے دہقان! امیروں کے چونچلے کیا جانیں؟ مجرموں کی طرح سر جھکائے۔ دم بخود کھڑے تھے۔ چہرہ پر خفت اور ندامت تھی۔ دلوں میں دھڑکن اور خوف۔ ایشور! بات بگڑ گئی ہے۔ اب تمہیں سنبھالو۔ برف کی

ٹھنڈک نہ ملی۔ تو ٹھاکر صاحب کے پاس کی آگ اَور بھی تیز ہوئی۔ غصّہ بھڑک اُٹھا۔ کڑک کر بولے "مَیں شیطان نہیں ہوں۔ کہ بکروں کے خون سے پیاس بجھاؤں۔ مجھے ٹھنڈا برف چاہیئے۔ اور یہ پیاس تمہارے اور تمہاری عورتوں کے آنسوؤں ہی سے بجھیگی احسان فراموش کم ظرف میں نے تمہیں زمین دی۔ مکان دیئے۔ اور حیثیت دی۔ اور اس کا صلہ یہ ہے۔ کہ مَیں کھڑا پانی کو ترستا ہوں۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہارے ساتھ کوئی رعایت کی جائے۔ کل شام تک مَیں تم میں سے کسی آدمی کی صورت اس گاؤں میں نہ دیکھوں۔ ورنہ قہر ہو جائے گا + تم جانتے ہو کہ مجھے اپنا حکم دہرانے کی عادت نہیں ہے۔ رات تمہاری ہے جو کچھ لے جا سکو لے جاؤ لیکن شام کو مَیں کسی کی منحوس صورت نہ دیکھوں + یہ رونا اور چیخنا فضول ہے۔ میرا دل پتھر کا ہے۔ اور کلیجہ لوہے کا۔ آنسوؤں سے نہیں پسیجتا"۔

اور ایسا ہی ہوا۔ دوسری رات کو سارے گاؤں میں کوئی دیا جلانے والا تک نہ رہا۔ پھولتا پھلتا ہوا گاؤں بھوت کا ڈیرا بن گیا۔

(۵)

عرصہ دراز تک یہ واقعہ قرب وجوار کے منچلے قصّہ گویوں کے

لئے دلچسپیوں کا ماخذ بنا رہا۔ ایک صاحب نے اُس پر اپنی طبع موزوں
کی جولانیاں بھی دکھائیں۔ بیچارے ٹھاکر صاحب ایسے بدنام ہوئے
کہ گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ بہت کوشش کی۔ کہ گاؤں آباد ہو جائے۔
لیکن کس کی جان بھاری تھی۔ کہ اس اندھیر نگری میں قدم رکھتا جہاں
فربہی کی سزا پھانسی تھی۔ کچھ مزدور پیشہ لوگ قسمت کا جوا کھیلنے آئے
مگر چند مہینوں سے زیادہ نہ جم سکے۔ اجڑا ہوا گاؤں کھویا ہوا اعتبار
ہے۔ جو بہت مشکل سے جمتا ہے۔ آخر جب کوئی بس نہ چلا۔ تو
ٹھاکر صاحب نے مجبور ہو کر اراضی معاف کا عام اعلان کر دیا۔
لیکن اس رعایت نے رہی سہی ساکھ بھی کھو دی + اس طرح
تین سال گزر جانے کے بعد ایک روز وہاں بنجاروں کا قافلہ آیا۔
شام ہو گئی تھی۔ اور پورب طرف سے تاریکی کی لہر بڑھتی چلی آتی
تھی۔ بنجاروں نے دیکھا۔ تو سارا گاؤں ویران پڑا ہوا ہے۔ جہاں
آدمیوں کے گھروں میں گدھ اور گیدڑ رہتے تھے۔ اس طلسم کا راز
سمجھ میں نہ آیا۔ مکانات موجود۔ زمین زرخیز۔ سبزہ سے لہراتے ہوئے
کھیت۔ اور انسان کا نام نہیں۔ کوئی اور گاؤں قریب نہ تھا۔
وہیں فروکش ہو گئے۔ جب صبح ہوئی۔ بیلوں کے گلوں کی گھنٹیوں
نے پھر اپنا نغمہ بیمیں الاپنا شروع کیا۔ اور قافلہ گاؤں سے کچھ دور

آپ کے لئے جان تک حاضر ہے"۔

ٹھاکر صاحب نے تیور بدل کر کہا "میں اپنی خوشامد سننے کا عادی نہیں ہوں"۔ بوڑھے ہرداس کی پیشانی پر بل پڑے۔ غرور کو چوٹ لگی۔ بولا "مجھے بھی خوشامد کرنے کی عادت نہیں ہے"۔

ٹھاکر صاحب نے اینٹھ کر جواب دیا۔ "تمہیں رئیسوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔ طاقت کی طرح تمہاری عقل بھی بڑھاپے کے نذر ہو گئی"۔

ہرداس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ غصہ کی حرارت سے سب کی آنکھیں پھیلی۔ اور استقلال کی سردی سے ماتھے سکڑے ہوئے تھے۔ بولا "ہم آپ کی رعیت ہیں۔ لیکن ہم کو اپنی آبرو پیاری ہے۔ اور چاہے اپنے زمیندار کو اپنا سر دے دیں۔ آبرو نہیں دے سکتے"۔

ہرداس کے کئی منچلے ساتھیوں نے بلند آواز میں تائید کی۔ آبرو جان کے پیچھے ہے۔ ٹھاکر صاحب کے غصہ کی آگ بھڑک اٹھی اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ زور سے بولے "تم لوگ زبان سنبھال کر باتیں کرو۔ ورنہ جس طرح گلے میں جھولیاں لٹکائے آئے تھے۔ اسی طرح نکال دیئے جاؤ گے۔ میں رپودمن سنگھ ہوں۔ جس نے تم جیسے کتنے

ہی ہیکڑوں کو اسی جگہ پیروں سے کچلوا ڈالا ہے"+ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے رسالے کے سردار ارجن سنگھ کو بلا کر کہا "ٹھاکر! اب ان چیونٹیوں کے پر نکل آئے ہیں۔ کل شام تک ان حشرات سے میرا گاؤں پاک وصاف ہو جائے +"

ہر داس کھڑا ہو گیا۔ غصہ اب چنگاری بن کر آنکھوں سے نکل رہا تھا۔ بولا "ہم نے اس گاؤں کو چھوڑنے کے لئے نہیں بسایا ہے۔ جب تک جئیں گے۔ اسی گاؤں میں رہیں گے۔ یہیں پیدا ہوں گے اور یہیں مریں گے + آپ بڑے آدمی ہیں۔ اور بڑوں کی سمجھ بھی بڑی ہوتی ہے۔ ہم لوگ اکھڑ گنوار ہیں۔ ناحق غریبوں کے جان کے پیچھے نہ پڑیئے۔ خون خرابہ ہو جائے گا۔ لیکن آپ کو یہی منظور رہے۔ تو ہماری طرف سے بھی آپ کے سپاہیوں کو چنوتی ہے۔ جب چاہیں دل کے ارمان نکال لیں +"

اتنا کہہ کر ٹھاکر صاحب کو سلام کیا۔ اور چل دیا + اُس کے ساتھی بھی انداز پُرغرور کے ساتھ اکڑتے ہوئے چلے + ارجن سنگھ نے اُن کے تیور دیکھے۔ سمجھ گیا۔ کہ لوہے کے چنے ہیں۔ لیکن شہدوں کا سرغنہ تھا۔ کچھ اپنے نام کی لاج تھی۔ دوسرے دن شام کے وقت جب رات اور دن میں مُٹھ بھیڑ ہو رہی تھی۔ ان دونوں جماعتوں

کا سامنا ہوا + پھر وہ دھول دھپا ہوا - کہ زمین تھرا گئی - زبانوں نے منہ کے اندر وہ معرکے دکھائے - کہ آفتاب مارے خوف کے پچھم میں جا چھپا - تب لاٹھیوں نے سر اُٹھایا - لیکن قبل اس کے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی دُعا اور شکریہ کی مستحق ہوں - ارجن سنگھ نے دانش مندی سے کام لیا - تاہم اُن کے چند آدمیوں کے لئے گڑ اور ہلدی پینے کے سامان ہو چکے تھے +

وکیل صاحب نے اپنی فوج کی یہ حالت زار دیکھی - کسی کے کپڑے پھٹے ہوئے کسی کے جسم پر گرد جمی ہوئی - کوئی ہانپتے ہانپتے بیدم - خون بہت کم نظر آیا - کیونکہ یہ ایک بے بہا جنس ہے - اور اسے ڈنڈوں کی زد سے بچا لیا گیا تھا - تو انہوں نے ارجن سنگھ کی پیٹھ ٹھونکی - اور اُن کی شجاعت وجانبازی کی خوب داد دی - رات کو اُن کے سامنے لڈو اور اِمرتیوں کی ایسی بارش ہوئی - کہ یہ سب گرد و غبار دُھل گیا - صبح کو اس رسالہ نے ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کی راہ لی - اور قسم کھا گئے - کہ اب بھول کر بھی اس گاؤں کا رُخ نہ کریں گے +

تب ٹھاکر صاحب نے گاؤں کے آدمیوں کو چوپال میں طلب کیا + اُن کے اشارہ کی دیر تھی - سب لوگ اکٹھے ہو گئے - تو

ٹھاکر صاحب ایک ایک کر کے اُن سے بغل گیر ہوئے - اور کہا -
مَیں ایشور کا بہت مشکور ہوں - کہ مجھے اس گاؤں کے لئے جن
آدمیوں کی تلاش تھی - وہ لوگ مل گئے + آپ کو معلوم ہے - کہ یہ
گاؤں کئی بار اجڑا اور کئی بار بسا - اس کا سبب یہی تھا - وہ لوگ
میرے معیار پر پورے نہ اُترتے تھے - مَیں اُن کا دشمن نہیں تھا -
لیکن میری دلی آرزو یہ تھی - کہ اس گاؤں میں وہ لوگ آباد ہوں -
جو ظلم و ستم کا مردوں کی طرح سامنا کریں - جو اپنے حقوق اور رعایت
کی مردوں کی طرح حفاظت کریں - جو حکومت کے نام سے نہ ہوں -
جو رعب اور اختیار کی نگاہ تیز دیکھ کر بچوں کی طرح خوف سے سہم
نہ جائیں - مجھے اطمینان ہے - کہ بہت نقصان اور ندامت اور
بدنامی کے بعد میری تمنائیں پوری ہو گئی ہیں - مجھے اطمینان ہے
کہ آپ ناموافق ہواؤں اور متلاطم موجوں کا کامیابی سے مقابلہ کریں
گے - میں آج اس گاؤں سے دستبردار ہوتا ہوں - آج سے
یہ آپ کی ملکیت ہے - آپ ہی اس کے زمیندار اور مختار ہیں -
ایشور سے میری یہی دعا ہے - کہ آپ پھولیں پھلیں اور سرسبز رہیں
ان الفاظ نے دلوں پر تسخیر کا کام کیا - لوگ آزادی کے جوش
سے مست ہو ہو کر ٹھاکر صاحب کے پیروں سے لپٹ گئے - اور کہنے

لگے۔ ہم آپ کے قدموں سے جیتے جی جدا نہ ہوں گے۔ آپ کا سا
مربی اور قدردان اور رعایا پرور بزرگ ہم کہاں پائیں گے؟" جانبازانہ
عقیدت اور ہمدردی۔ وفاداری اور احسان کا ایک بڑا دردناک
اور مؤثر نظارہ آنکھوں کے سامنے پیش ہو گیا۔ لیکن ٹھاکر صاحب
اپنے فیاضانہ ارادہ پر ثابت قدم رہے۔ اور گو پچاس سال سے
زیادہ گزر گئے ہیں۔ لیکن انہیں بنجاروں کے ورثاء ابھی تک
موضع صاحب گنج کے معافی دار ہیں۔ عورتیں ابھی تک ٹھاکر
رپودمن سنگھ کی پوجا اور منتیں کرتی ہیں۔ اور گو اب اس موضع
کے کئی نوجوان دولت اور حکومت کی بلندیوں پر پہنچ گئے ہیں۔
لیکن بوڑھے اور اکھڑ ہری داس کے نام پر اب بھی فخر کرتے ہیں
اور بھادوں سُدی ایکادشی کے دن اب بھی اس مبارک فتح کی
یادگار میں جشن منائے جاتے ہیں۔

تریا چرتر

(۱)

سیٹھ لگن داس جی کا نخلِ حیات بے ثمر تھا۔ کوئی ایسی انسانی روحانی یا طبّی کوشش نہ تھی۔ جو انہوں نے نہ کی ہو۔ یوں شادی میں مسئلہ توحید کے قائل تھے۔ مگر ضرورت اور اصرار سے مجبور ہو کر ایک دو نہیں پانچ شادیاں کیں۔ یہاں تک کہ عمر عزیز کے چالیس سال گزر گئے۔ اور خانہ تاریک روشن نہ ہوا + بیچارے بہت سنجیدہ رہتے۔ یہ مال و زر۔ یہ کرّ و فر۔ یہ امیرانہ اہتمام۔ یہ تزک و احتشام کیا ہوں گے! میرے بعد ان کا کیا حشر ہوگا؟ کون ان سے حظ اُٹھائے گا؟ یہ خیال بہت افسوس ناک تھا۔ آخر یہ صلاح ہوئی۔ کہ کسی لڑکے کو گود لینا چاہیے۔ مگر یہ مسئلہ خاندانی نزاعات کے باعث کئی سالوں تک معرض التوا میں رہا + جب سیٹھ جی نے دیکھا

کہ بیویوں میں اب تک بدستور کشمکش ہو رہی ہے۔ تو انہوں نے اخلاقی
جرأت سے کام لیا۔ اور ایک ہونہار یتیم لڑکے کو گود لے لیا + اُس کا
نام رکھا گیا مگن داس + اس کا سن پانچ چھ سال سے زائد نہ تھا۔ بلا کا
ذہین اور باتمیز۔ مگر عورتیں سب کچھ کر سکتی ہیں۔ دوسرے کے بچے
کو اپنا نہیں سمجھ سکتیں۔ یہاں تو پانچ عورتوں کا ساجھا تھا۔ اگر ایک اسے
پیار رکھتی۔ تو باقی چار عورتوں کا فرض تھا۔ کہ اُس سے نفرت کریں۔
ہاں سیٹھ جی اُس کے ساتھ بالکل اپنے لڑکے کی سی محبت کرتے
تھے + پڑھانے کو ماسٹر رکھے۔ سواری کے لئے گھوڑے + رئیسانہ
خیال کے آدمی تھے۔ راگ رنگ کا سامان بھی مہیا تھا۔ گانا سیکھنے
کا لڑکے نے شوق کیا۔ تو اس کا بھی انتظام ہو گیا + غرض جب مگن داس
سن شباب کو پہنچا۔ تو رئیسانہ مشاغل میں اسے درجہ کمال حاصل تھا۔
اس کا گانا سن کر اُستاد لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے۔ شہسوار ایسا کہ دوڑتے
ہوئے گھوڑے پر سوار ہو جاتا۔ قد و قامت میں شکل و شباہت میں
اُس کا سا ایسا جوان دہلی میں کم ہو گا + شادی کا مسئلہ درپیش ہوا۔
ناگپور کے کروڑپتی سیٹھ مکھن لال بہت لہرائے ہوئے تھے۔ اُن کی
لڑکی سے شادی ہو گئی + دھوم دھام کا ذکر کیا جائے۔ قصۂ شب
ہجر سے بھی طویل ہو جائے۔ مکھن لال کا اسی شادی میں دیوالہ نکل

گیا+اس وقت مگن داس سے زیادہ قابل رشک آدمی اَور کون ہوگا؟
اُس کی زندگی کی بہار اُمنگوں پر تھی۔ اور مرادوں کے پھول اپنی
شبنمی تازگی میں کھل کھل کر حسن اور شگفتگی کا سماں دکھا رہے تھے۔
مگر تقدیر کی دیوی کچھ اَور ہی سامان کر رہی تھی۔ وہ سیر و سیاحت
کے ارادہ سے جاپان گیا ہوا تھا۔ کہ دہلی سے خبر آئی۔ کہ "ایشور نے
تمہیں ایک بھائی دیا ہے۔ مجھے اتنی خوشی ہے۔ کہ زیادہ عرصے
تک زندہ نہ رہ سکوں۔ تم بہت جلد لوٹ آؤ"+
مگن داس کے ہاتھ سے تار کا کاغذ چھوٹ گیا۔ اور سر میں
ایسا چکر آیا۔ کہ گویا کسی بلندی سے گر پڑا ہے+

(۲)

مگن داس کی کتابی واقفیت بہت کم تھی۔ مگر طبعی شرافت
سے وہ خالی نہ تھا۔ ہاتھوں کی فیاضی نے جو فراغت کی برکت ہے
دل کو بھی فیاض بنا دیا تھا۔ اُسے اتفاقات کی اس کایا پلٹ سے
صدمہ تو ضرور ہوا۔ آخر انسان ہی تھا۔ مگر اُس نے استقلال سے
کام لیا۔ اور ایک امید و بیم کی حالت میں وطن کو روانہ ہوا+ رات
کا وقت تھا۔ جب اپنے دروازے پر پہنچا۔ تو بزم نشاط آراستہ دیکھی
اُس کے قدم آگے نہ بڑھے۔ ٹھٹ پڑا۔ اور ایک دکان کے چبوترے

پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ اتنا تو اُسے یقین تھا۔ کہ سیٹھ جی اُس کے ساتھ اُسی اخلاق اور محبت سے پیش آئیں گے بلکہ شاید اب اَور بھی عنایت کرنے لگیں۔ سیٹھانیاں بھی اب اس کے ساتھ مغائرت کا برتاؤ نہ کریں گی ممکن ہے۔ منجھلی بہو جو اس بچے کی خوش نصیب ماں تھیں۔ اُس سے محترز رہیں۔ مگر باقی چاروں سیٹھانیوں کی جانب سے خاطر و مدارات میں کوئی شک نہیں تھا ان کے حسد سے وہ فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ تاہم اُس کی غیرت نے گوارا نہ کیا۔ کہ جس گھر میں آقا کی حیثیت سے رہتا تھا۔ اُسی گھر میں اب ایک دست نگر کی حیثیت سے زندگی بسر کرے۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ اب یہاں رہنا نہ مناسب ہے نہ مصلحت۔ مگر جاؤں کہاں؟ نہ کوئی ایسا فن سیکھا۔ نہ کوئی ایسا علم حاصل کیا۔ جس سے کسب معاش کی صورت پیدا ہوتی۔ رئیسانہ مشاغل اسی وقت تک قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ جب تک کہ وہ رئیسوں کے زیورِ کمال رہیں۔ ذریعہ معاش بن کر وہ پایۂ عزت سے گر جاتے ہیں۔ اپنی روزی حاصل کرنا تو اُس کے لئے کوئی ایسا مشکل کام نہ تھا۔ کسی سیٹھ ساہوکار کے یہاں منیب بن سکتا تھا۔ کسی کارخانہ کی طرف سے ایجنٹ ہو سکتا تھا۔ مگر اُس

کے کندھے پر ایک بھاری جوا رکھا ہوا تھا۔ اُسے کیا کرے؟ ایک بڑے سیٹھ کی لڑکی جس نے نازو نعمت میں پرورش پائی۔ اُس سے یہ بینوائی کی تکلیفیں کیونکر جھیلی جائیں گی؟ کیا مکھن لال کی لاڈلی بیٹی ایک ایسے شخص کے ساتھ رہنا پسند کرے گی۔ جسے نانِ شبینہ کا بھی ٹھکانا نہیں! مگر اس فکر میں اپنی جان کیوں کھپاؤں؟

مَیں نے اپنی مرضی سے شادی نہیں کی۔ میں برابر انکار کرتا رہا۔ سیٹھ جی نے زبردستی میرے پیروں میں بیڑی ڈالی ہے۔ اب وہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن جب اُس نے دوبارہ ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور کیا۔ تو مفر کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ بالآخر اس نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ پہلے اُکپور چلوں۔ ذرا اُن مہارانی کے طور وطریق کو دیکھوں۔ باہر ہی باہر اُن کے مزاج اور خواص کی جانچ کروں۔ اُس وقت طے کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اگر ریاست کی بو اُن کے دماغ سے نکل گئی ہے۔ اور میرے ساتھ روکھی روٹیاں اُنہیں کھانا منظور ہیں۔ تو ازیں چہ بہتر۔ لیکن اگر وہ امیرانہ تکلفات کی دلدادہ ہیں۔ تو میرے لئے راستہ صاف ہے۔ پھر میں ہوں۔ اور غمِ دنیا۔ ایسی جگہ جاؤں۔ جہاں کسی آشنا کی صورت خواب میں بھی نہ دکھائی دے۔ افلاس

کی ذلت ذلت نہیں رہتی۔ اگر اجنبیوں میں زندگی بسر کی جائے۔ یہ ہچشموں کی کنکھیاں اور سرگوشیاں ہیں۔ جو افلاس کو عذاب بنا دیتی ہیں۔ یوں دل میں زندگی کا نقشہ بنا کر مگن داس اپنی ہمت مردانہ کے بھروسے پر ناگپور کی طرف چلا۔ اس ملاح کی طرح جو بغیر کشتی و بادبان کے دریا کی اُمڈتی ہوئی لہروں میں اپنے تئیں ڈال دے۔

(۳)

شام کے وقت سیٹھ مکھن لال کے پُر فضا باغ میں سورج کی زرد کرنیں مرجھائے ہوئے پھولوں سے گلے مل کر رخصت ہو رہی تھیں۔ باغ کے وسط میں ایک پختہ کنواں تھا۔ اور ایک مولسری کا درخت۔ کنوئیں کے منہ پر تاریکی کی نیلگوں نقاب تھی۔ درخت کے سر پر روشنی کی سنہری چادر۔ اسی درخت کے نیچے ایک بوڑھی مالن بیٹھی ہوئی پھولوں کے ہار اور گجرے گوندھ رہی تھی۔ اتنے میں ایک نوجوان تھکا ماندہ کنوئیں پر آیا۔ اور لوٹے سے پانی بھر کر پینے کے بعد جگت پر بیٹھ گیا۔ مالن نے پوچھا "کہاں جاؤ گے"؟

مگن داس نے جواب دیا۔ کہ "جانا تو تھا بہت دور۔ مگر یہیں رات ہو گئی۔ یہاں کہیں ٹھہرنے کا ٹھکانہ مل جائے گا"؟

مالن۔ چلے جاؤ سیٹھ جی کے دھرم سالے ہیں۔ بڑے آرام کی

جگہ ہے۔
مگن داس۔ دھرم سالے میں تو مجھے ٹھہرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ کوئی ہرج نہ ہو تو یہیں پڑ رہوں۔ یہاں کوئی رات کو رہتا ہے؟
مالن۔ بھائی مَیں یہاں ٹھہرنے کو نہ کہونگی۔ یہ ملی ہوئی بائی جی کی بیٹھک ہے۔ جھروکے میں بیٹھ کر سیر کیا کرتی ہیں۔ کہیں دیکھ پائیں۔ تو میرے سر میں ایک بال بھی نہ رہے۔
مگن داس۔ بائی جی کون؟
مالن۔ یہی سیٹھ جی کی بیٹی اندرا بائی۔
مگن داس۔ یہ گجرے اُنہیں کے لئے بنا رہی ہو کیا؟
مالن۔ ہاں۔ اور سیٹھ جی کے یہاں ہے ہی کون؟ پھولوں کے گہنے بہت پسند کرتی ہیں۔
مگن داس۔ شوقین عورت معلوم ہوتی ہیں؟
مالن۔ بھائی یہی تو بڑے آدمیوں کی باتیں ہیں۔ وہ شوق نہ کریں تو ہمارا تمہارا نباہ کیسے ہو؟ اور دھن ہے کس لئے؟ اکیلی جان پر دس لونڈیاں ہیں۔ سُنا کرتی تھی۔ کہ بھاگوان آدمی کا ہل بھوت جوتتا ہے۔ وہ آنکھوں دیکھا۔ آپ ہی آپ پنکھا چلنے لگے۔

آپ ہی آپ سارے گھر میں دن کا سا اُجالا ہو جائے۔ تم جھوٹ سمجھتے ہو گے مگر میں آنکھوں کی دیکھی بات کہتی ہوں۔

اُس احساس فضیلت کے ساتھ جو کسی بے علم آدمی کے سامنے اپنی معلومات کے بیان کرنے میں ہوتا ہے۔ بوڑھی مالن اپنی ہمہ دانی کا اظہار کرنے لگی۔ لگن داس نے اُکسایا "ہو گا بھائی بڑے آدمیوں کی باتیں نرالی ہوتی ہیں لکشمی کے بس میں سب کچھ ہے۔ مگر اکیلی جان پر دس لونڈیاں؟ سمجھ میں نہیں آتا"۔

مالن نے پیرانہ چڑچڑے پن سے جواب دیا "تمہاری سمجھ موٹی ہو تو کوئی کیا کرے؟ کوئی پان لگاتی ہے۔ کوئی پنکھا جھلاتی ہے۔ کوئی کپڑے پہناتی ہے۔ دو ہزار روپیہ میں تو سیج گاڑی آئی تھی۔ چاہو تو مُنہ دیکھ لو۔ اس پر ہوا کھانے جاتی ہیں۔ ایک بنگالن گانا بجانا سکھاتی ہے۔ میم پڑھانے آتی ہے۔ شاستری جی سنسکرت پڑھاتے ہیں۔ کاگد پر ایسی مورت بناتی ہیں۔ کہ اب بولی اور اب بولی۔ دل کی رانی ہے۔ بیچاری کے بھاگ چھوٹ گئے۔ دلی کے سیٹھ لگن داس کے بالک لڑکے سے بیاہ ہوا تھا۔ مگر رام جی کی لیلا۔ ستّر برس کے مردے کو لڑکا دیا۔ کون پتیا لے گا۔ جب سے یہ سناؤنی آئی ہے۔ تب سے بہت اُداس رہتی ہیں۔ ایک

دن روتی تھیں - میرے سامنے کی بات ہے - باپ نے دیکھ لیا۔ سمجھانے لگے + لڑکی کو بہت چاہتے ہیں۔ سنتی ہوں داماد کو یہیں بلا کر رکھیں گے - نارائن کرے میری رانی دودھوں نہائے - پوتوں پھلے - مالی مرگیا تھا - انہوں نے آڑ نہ دی ہوتی - تو گھر گھر کے ٹکڑے مانگتی"۔

مگن داس نے ایک ٹھنڈی سانس لی + بہتر ہے - اب یہاں سے اپنی عزت آبرو لئے ہوئے چل دو - یہاں میرا نباہ نہ ہوگا - اندرا رئیس زادی ہے - تم اس قابل نہیں ہو - کہ اُس کے شوہر بن سکو - مالن سے بولا " تو دھرم سالے میں جاتا ہوں - جانے وہاں کھاٹ واٹ مل جاتی ہے - کہ نہیں ! مگر رات تو کاٹنی ہے کسی طرح کٹ ہی جائے گی - رئیسوں کے لئے مخملی گدے چاہئیں - ہم مزدوروں کے لئے پوال ہی بہت ہے"۔

یہ کہہ کر اُس نے لٹیا اُٹھائی - ڈنڈا سنبھالا - اور بادل پُردرد ایک طرف کو چل دیا۔

اس وقت اندرا اپنے جھروکے پر بیٹھی ہوئی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی + کیا اتفاق کی خوبی ہے - کہ عورت کو جنت کی نعمتیں حاصل - اور اُس کا شوہر آوارۂ وطن - جسے رات کاٹنے

کا ٹھکانا نہیں +

(۴)

مگن داس مایوسانہ خیالات میں ڈوبا ہوا شہر سے باہر نکل آیا اور ایک سرائے میں ٹھہرا۔ جو صرف اس لئے مشہور تھی۔ کہ وہاں شراب کی ایک دوکان تھی + یہاں قرب و جوار سے مزدور لوگ آ آ کر غم غلط کیا کرتے تھے + جو بھولے بھٹکے مسافر یہاں ٹھہرتے اُنہیں ہوشیاری اور چوکسی کا عملی سبق مل جاتا تھا۔ مگن داس تھکا ماندہ تھا ہی ایک پیڑ کے نیچے چادر بچھا کے سو رہا ۔ اور جب صبح کو نیند کھلی۔ تو اُسے کسی پیر و مرشد کی زندہ تلقین معرفت کا کرشمہ نظر آیا۔ جس کی پہلی منزل ترک دنیا ہے۔ اس کی مختصر بقچی جس میں دو ایک کپڑے اور زاد راہ اور لُٹیا ڈور بندھی ہوئی تھی۔ غائب ہو گئی تھی۔ بجز اُن کپڑوں کے جو اُس کے بدن پر تھے۔ اب اُس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اور بھوک جو افلاس میں اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ اُسے بیچین کر رہی تھی۔ مگر مستقل مزاج آدمی تھا۔ اُس نے قسمت کا رونا نہیں رویا۔ گزران کی تدبیریں سوچنے لگا + سیاق و سباق میں اُسے اچھی دستگاہ تھی ۔ مگر اس حیثیت میں اس سے فائدہ اُٹھانا غیر ممکن تھا۔ اس نے فن نغمہ میں بہت

ریاض کیا تھا۔ کسی رنگین مزاج رئیس کے دربار میں اُس کی قدر ہوسکتی تھی۔ مگر اُس کی مردانہ غیرت نے اس پیشہ کو اختیار کرنے کی اجازت نہ دی + ہاں وہ اعلےٰ درجہ کا شہسوار تھا - اور یہ فن شان وضع داری کے ساتھ اُس کی معاش کا وسیلہ بن سکتا تھا + یہ مصمم ارادہ کرکے اُس نے قدم ہمت آگے بڑھائے + بظاہر یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ مگر وہ اپنا بوجھ ہلکا ہوجانے سے اس وقت بہت رنجیدہ خاطر نہیں تھا۔ مردانہ ہمت کا آدمی ایسی اُفتادوں کو اُسی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جس سے ایک ہوشیار طالب علم امتحان کے سوالات کو دیکھتا ہے۔ اُسے اپنی ہمت آزمانے کا - ایک مشکل سے عہدہ برا ہونے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اس کی ہمت نادانستہ طور پر مضبوط ہوجاتی ہے - فی الواقعہ ایسے معرکے مردانہ حوصلے کے لئے تحریک کا کام دیتے ہیں + مگن داس اِس جوش سے قدم بڑھاتا چلا جاتا تھا۔ گویا کامیابی کی منزل سامنے نظر آرہی ہے - مگر شاید وہاں کے گھوڑوں نے شرارت اور سرکشی سے توبہ کر لی تھی - یا وہ خلقی طور پر خوشگام و سبک خرام واقع ہوئے تھے - وہ جس گاؤں میں جاتا ہمت کی بجائے یاس کو اکسا نیوالا جواب پاتا + بالاخر شام کے وقت جب آفتاب اپنی منزل مقصو

پرجا پہنچا تھا۔ اس کی منزل دشوار تمام ہوئی۔ ناگر گھاٹ کے ٹھاکر اٹل سنگھ نے اس کی فکر معاش کا خاتمہ کیا۔

یہ ایک بڑا گاؤں تھا۔ پختہ مکانات بہت تھے۔ مگر اُن میں آسمانی روحیں آباد تھیں۔ کئی سال پہلے پلیگ نے آبادی کے بڑے حصّے کو عالم سفلی سے اٹھا کر عالم علوی میں پہنچا دیا تھا۔ اس وقت پلیگ کے موجودہ اور خانہ برانداز جانشین گاؤں کے نوجوان اور شوقین زمیندار صاحب اور حلقہ کے کارگزار اور ذی رُعب تھانہ دار صاحب تھے۔ اُن کی متفقہ سرگرمیوں سے گاؤں میں تنگی کا راج تھا۔ مال و دولت کو لوگ عذاب جان سمجھتے تھے۔ اسے گناہ کی طرح چھپاتے تھے۔ گھر گھر میں روپے رہتے ہوئے لوگ قرض لے لے کر کھاتے۔ اور پھٹے حالوں رہتے تھے۔ اسی میں نباہ تھا۔ کاجل کی کوٹھری تھی۔ سفید کپڑے پہننا اُن پر دھبہ لگاتا تھا۔ حکومت اور جبر کا بازار گرم تھا۔ اہیروں کے یہاں انجن کے لئے بھی دودھ نہ تھا۔ تھانہ میں دودھ کی ندی بہتی تھی۔ مویشی خانہ کے محرّر دودھ کی کلیاں کرتے تھے۔ اسی اندھیر نگری کو مگن داس نے اپنا مسکن بنایا۔ ٹھاکر صاحب نے غیر معمولی فیاضی سے کام لے کر اسے رہنے کے

لئے ایک مکان بھی دے دیا۔ جو صرف بہت وسیع معنوں میں مکان کہا جا سکتا تھا۔ اسی گوشۂ قناعت میں وہ ایک ہفتہ سے زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ اُس کا چہرہ زرد ہے۔ اور کپڑے میلے ہو رہے ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُسے اب ان باتوں کی حس ہی نہیں رہی۔ زندہ ہے۔ مگر زندگی رخصت ہو گئی ہے۔ ہمت اور حوصلہ مشکل کو آسان کر سکتے ہیں۔ آندھی اور طوفان سے بچا سکتے ہیں۔ مگر بشاشت ان کے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ ٹوٹی ہوئی ناؤ پر بیٹھ کر ملار گانا ہمت کا کام نہیں۔ حماقت کا کام ہے۔

ایک روز جب شام کے وقت وہ اندھیرے میں گھاٹ پر پڑا ہوا تھا۔ ایک عورت اُس کے دروازے پر آ کر بھیک مانگنے لگی۔ مگن داس کو آواز مانوس معلوم ہوئی۔ باہر آ کر دیکھا۔ تو وہی چمپا مالن تھی۔ کپڑے تار تار مصیبت کی روتی ہوئی تصویر۔ بولا "مالن؟ تمہاری یہ کیا حالت ہے؟ مجھے پہچانتی ہو؟"

مالن نے چونک کر دیکھا۔ اور پہچان گئی۔ رو کر بولی "بیٹا اب بتاؤ میرا کہاں ٹھکانا لگے؟ تم نے میرا بنا بنایا گھر اجاڑ دیا۔ نہ اُس دن تم سے باتیں کرتی نہ مجھ پر یہ بپتا پڑتی۔ بائی نے تمہیں بیٹھے دیکھ لیا۔ باتیں بھی سنیں۔ صبح ہوتے ہی مجھے بلایا۔ اور برس پڑیں۔ ناک

کٹوا دوں گی۔ منہ میں کالکھ لگوا دوں گی۔ چڑیل۔ کٹنی تو میری بات کسی غیر آدمی سے کیوں چلائے؟ تو دوسروں سے میرا چرچا کیوں کرے؟ وہ کیا تیرا داماد تھا۔ جو تو اُس سے میرا دُکھڑا روتی تھی؟ جو کچھ منہ میں آیا بکتی رہیں۔ مجھ سے بھی نہ سہا گیا۔ رانی روٹھیں گی۔ اپنا سہاگ لیں گی۔ بولی بائی جی مجھ سے قصور ہُوا۔ لیجئے۔ اب جاتی ہوں چھینکتے ناک کٹتی ہے۔ تو میرا نباہ یہاں نہ ہوگا۔ ایشور نے منہ دیا ہے۔ تو آہار بھی دے گا۔ چار گھر سے مانگوں گی۔ تو میرے پیٹ کو ہو جائے گا"۔ اُس چھوکری نے مجھے کھڑے کھڑے نکلوا دیا۔ بتاؤ میں نے تم سے اُس کی کون سی شکایت کی تھی۔ اس کی کیا چرچا کی تھی؟ میں تو اس کا بکھان کر رہی تھی۔ مگر بڑے آدمیوں کا غصہ بھی بڑا ہوتا ہے۔ اب بتاؤ میں کس کی ہو کر رہوں؟ آٹھ دن اسی طرح ٹکڑے مانگتے ہو گئے۔ ایک بھتیجی انہیں کے یہاں لونڈیوں میں نوکر تھی۔ اسی دن اُسے بھی نکال دیا۔ تمہاری بدولت جو کبھی نہ کیا تھا۔ وہ کرنا پڑا۔ تمہیں کاہے کو دوش لگاؤں؟ قسمت میں جو کچھ لکھا تھا۔ وہ دیکھنا پڑا۔

مگن داس سناٹے میں آ گیا۔ آہ ظرف کا یہ ظالم ہے۔ یہ غرور یہ شان تحکم! مالن کو تشفی دی۔ اُس کے پاس اگر دولت ہوتی

تو اُسے مالامال کر دیتا۔ سیٹھ مکھن لال کی صاحبزادی کو بھی معلوم ہو جاتا۔ کہ رزق کی کنجی اسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بولا "تم فکر نہ کرو۔ میرے گھر میں آرام سے رہو۔ اکیلے میرا جی بھی نہیں لگتا سچ کہو تو مجھے تمہاری طرح ایک عورت کی تلاش تھی۔ اچھا ہُوا تم آگئیں"۔

مالن نے دامن پھیلا کر دعائیں دیں "بیٹا تم جُگ جُگ جیو بڑی اُمر (عمر) ہو۔ یہاں کوئی گھر ملے۔ تو مجھے دلوا دو۔ مَیں یہاں رہوں گی۔ تو میری بھتیجی کہاں جائے گی؟ وہ بیچاری شہر میں کس کے آسرے رہے گی"؟ مگن داس کا خون حمیت جوش میں آیا۔ ان پر یہ آفت میری لائی ہوئی ہے۔ ان کی اس آوارہ گردی کا ذمہ وار میں ہوں۔ "بولا۔ کوئی ہرج نہ ہو تو اُسے بھی یہیں لے آؤ۔ مَیں دن کو یہاں بہت کم رہتا ہوں۔ رات کو باہر چارپائی ڈال کر پڑ رہا کروں گا۔ میری وجہ سے تم لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ یہاں دوسرا مکان ملنا دشوار ہے۔ یہی جھونپڑا بڑی مشکلوں سے ملا ہے۔ یہ اندھیر نگری ہے۔ جب تمہارا سبھیتا کہیں لگ جائے۔ تو چلی جانا"۔

مگن داس کو کیا معلوم تھا۔ کہ حضرت عشق اُس کی زبان

پر بیٹھے ہوئے اس سے یہ باتیں کہلا رہے ہیں! کیا یہ صحیح ہے۔ کہ عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے؟

(۵)

ناگپور اس گاؤں سے بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ چمپا اُسی دن چلی گئی۔ اور تیسرے دن رمبھا کے ساتھ لوٹ آئی + یہ اُس کی بھتیجی کا نام تھا+ اُس کے آنے سے جھونپڑے میں جان سی پڑ گئی۔ مگن داس کے ذہن میں مالن کی لڑکی کی جو تصویر تھی۔ اس کو رمبھا سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ وہ جنس حسن کا مشتاق جوہری تھا۔ مگر ایسی صورت جس پر شباب کی مستانہ اور فتنہ خیز دلاویزیاں نثار ہو رہی ہوں۔ اُس کی نظر سے کبھی نہیں گزری تھی۔ اُس کی جوانی کا چاند اپنی سنہری اور متین شان کے ساتھ چمک رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ مگن داس دروازہ پر پڑا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ رمبھا سر پر گھڑا رکھے پانی بھرنے کو نکلی۔ مگن داس نے اُسے دیکھا۔ اور ایک لمبی سانس کھینچ کر اُٹھ بیٹھا۔ خط و خال بہت ہی دلفریب۔ تازہ پھول کی طرح شگفتہ چہرہ آنکھوں میں متین سادگی کا جلوہ۔ مگن داس کو اُس نے بھی دیکھا۔ چہرہ پر حیا کی سُرخی نمودار ہو گئی۔ عشق نے پہلا وار کیا+

مگن داس سوچنے لگا ۔کیا تقدیر یہاں کوئی اَور گل کھلانے والی ہے ؟ کیا دل مجھے یہاں بھی چین نہ لینے دے گا ؟ رمبھا تو یہاں ناحق آئی ۔ ناحق ایک غریب کا خون تیرے سر پر ہوگا ۔ مَیں تو اب تیرے ہاتھوں بک چکا ۔ مگر کیا تو بھی میری ہو سکتی ہے ؟ لیکن نہیں اتنی عجلت نہیں ۔ دل کا سودا سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے ۔ تم کو ابھی ضبط کرنا ہوگا ۔ رمبھا حسین ہے ۔ مگر جھوٹے موتی کی آب و تاب اُسے سچا نہیں بنا سکتی ۔ تمہیں کیا خبر کہ اس بھولی نازنین کے کان حرفِ محبّت سے آشنا نہیں ہو چکے ہیں ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا باغِ حُسن کسی گلچیں کی دست درازیوں سے آلودہ نہیں ہو چکا ؟ اگر چند دنوں کی دلبستگی کے لیئے ایک مشغلہ کی ضرورت ہے ۔ تو تم آزاد ہو ۔ مگر یہ نازک معاملہ ہے ۔ ذرا سنبھل کے قدم رکھنا ۔ پیشہ ور ذاتوں میں حُسنِ ظاہری اکثر اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے ۔

تین مہینے گزر گئے ۔ مگن داس رمبھا کو جوں جوں مؤشگافانہ نگاہوں سے دیکھتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس پر پریم کا رنگ گاڑھا ہوتا جاتا تھا ۔ وہ روزانہ اسے کنوئیں سے پانی نکالتے دیکھتا ۔ وہ روز گھر میں جھاڑو دیتی ۔ روز کھانا پکاتی ۔ آہ مگن داس کو اُن جوا-

کی روٹیوں میں جو مزہ آتا تھا۔ وہ کبھی نعمتوں کے خوانِ لطیف میں بھی نہ آیا تھا۔ اُسے اپنی کوٹھڑی ہمیشہ صاف اور ستھری ملتی نہ جانے کون اس کے بستر بچھا دیتا۔ کیا یہ رمبھا کی عنایت تھی؟ اس کی نگاہیں کیسی شرمیلی تھیں۔ اس نے اُسے کبھی اپنی طرف شوخ نگاہوں سے تاکتے نہیں دیکھا۔ آواز کیسی میٹھی۔ اس کی ہنسی کی آواز کبھی اُس کے کان میں نہیں آئی + اگر مگن داس اس کے پریم میں متوالا ہو رہا تھا۔ تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی + اُس کی گرسنہ نگاہیں اضطراب اور اشتیاق میں ڈوبی ہوئی ہمیشہ رمبھا کو ڈھونڈا کرتیں۔ وہ جب کسی دوسرے گاؤں کو جاتا۔ تو میلوں تک اس کی پُر بضد اور بیتاب آنکھیں مُڑ مُڑ کر جھونپڑے کے دروازے کی طرف آتیں۔ اُس کی شہرت قرب وجوار میں پھیل گئی تھی۔ مگر اُس کی خلقی مروت اور کشادہ ظرفی سے اکثر لوگ بیجا فائدہ اٹھاتے۔ انصاف پسند حضرات تو خاطر و مدارات سے کام نکال لیتے اور جو لوگ زیادہ دانشمند تھے۔ وہ متواتر تقاضوں کے منتظر رہتے۔ چونکہ مگن داس اس فن سے بیگانہ محض تھا۔ اس لئے باوجود شب وروز کی دوا دوش کے افلاس سے اس کا گلا نہ چھوٹتا۔ جب وہ رمبھا کو چکی پیتے ہوئے دیکھتا تو گیہوں کے ساتھ اس کا

دل بھی پس جاتا تھا۔ وہ کنوئیں سے پانی نکالتی۔ تو اس کا کلیجہ نکل آتا۔ جب وہ پڑوس کی عورتوں کے کپڑے سینتی تو کپڑوں کے ساتھ مگن داس کا دل چھد جاتا۔ مگر کچھ بس نہ تھا نہ قابو۔

مگن داس کی رمز شناس نگاہوں کو اس میں تو کوئی شک نہیں تھا۔ کہ اس کی کشش محبت بالکل بے اثر نہیں ہے۔ ورنہ رمبھا کی وفادارانہ خاطر داریوں کو کس خیال سے منسوب کرتا؟ وفا ہی وہ جادو ہے جو غرور حسن کا سر بھی نیچا کر سکتی ہے۔ مگر عاشقانہ رسائی پیدا کرنے کا مادہ اس میں بہت کم تھا۔ کوئی دوسرا منچلا عاشق اب تک اپنے عمل تسخیر میں کامیاب ہو چکا تھا۔ لیکن مگن داس نے دل عاشق کا پایا تھا۔ اور زبان معشوق کی۔

ایک روز شام کے وقت چمپا کسی کام سے بازار گئی ہوئی تھی اور مگن داس حسب معمول چارپائی پر پڑا خواب دیکھ رہا تھا۔ کہ رمبھا ایک شان رعنائی کے ساتھ آ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کا بھولا چہرہ کنول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اور آنکھوں سے ہمدردی کا پاک جذبہ جھلک رہا تھا۔ مگن داس نے اس کی طرف پہلے حیرت اور پھر محبت کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور دل پر زور ڈال کر بولا۔ "آؤ رمبھا! تمہیں دیکھنے کو بہت دن سے آنکھیں ترس رہی تھیں"۔

رمبھا نے بھولے پن سے کہا۔ "میں یہاں نہ آتی۔ تو تم مجھ سے کبھی نہ بولتے"۔

مگن داس کا حوصلہ بڑھا۔ بولا۔ "بلا مرضی پائے تو کُتا بھی نہیں آتا"۔

رمبھا مسکرائی۔ کلی کھل گئی۔ "میں تو آپ ہی چلی آئی"۔

مگن داس کا کلیجہ اُچھل پڑا۔ اس نے جرأت کر کے رمبھا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور جذبہ سے کانپتی ہوئی آواز سے بولا۔ "نہیں رمبھا ایسا نہیں ہے۔ یہ میری مہینوں کی تپسیا کا پھل ہے"۔

مگن داس نے بیتاب ہو کر اُسے گلے سے لگا لیا۔ جب وہ چلنے لگی۔ تو اپنے عاشق کی طرف محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ "اب یہ پریت ہم کو نباہنی ہو گی"۔

پو پھٹنے کے وقت جب سورج دیوتا کے آمد کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مگن داس کی آنکھ کھلی۔ رمبھا آٹا پیس رہی تھی۔ اس پرسکون سناٹے میں چکی کی گھُمر گھُمر بہت سہانی معلوم ہوتی تھی۔ اور اس سے سُر ملا کر رمبھا اپنے دلکش انداز سے گاتی تھی۔

"جھُلنیا موری پانی میں گری۔
میں جانوں پیا مجھ کو منیہیں۔ اُلٹی منانوں مجھ کو پڑی"۔

"چھلنیا موری پانی میں گری"

سال بھر گزر گیا۔ مگن داس کی محبت اور رمبھا کے سلیقہ نے مل کر اس ویران جھونپڑے کو کنج باغ بنا دیا۔ اب وہاں گائیں تھیں پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ اور کئی دیہاتی وضع کے مونڈھے تھے۔ فراغت اور آسائش کی برکتیں نمودار تھیں۔

ایک روز صبح کے وقت مگن داس کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ کہ ایک معزز آدمی انگریزی لباس پہنے اُسے ڈھونڈھتا ہوا آپہنچا۔ اور اسے دیکھتے ہی دوڑ کر گلے سے لپٹ گیا۔ مگن داس اور وہ دونوں ایک ساتھ پڑھا کئے تھے۔ وہ اب وکیل ہوگیا تھا۔ مگن داس نے بھی اب اُسے پہچانا۔ اور کچھ جھینپا اور کچھ جھجکتا۔ اس سے بغل گیر ہوگیا۔ بڑی دیر تک دونوں دوست باتیں کرتے رہے۔ باتیں کیا تھیں۔ واقعات اور اتفاقات کی ایک ضخیم داستان تھی۔ کئی مہینے ہوئے سیٹھ مگن کا چھوٹا بچہ چیچک کی نذر ہوگیا۔ سیٹھ جی نے فرط ملال سے خودکشی کر لی۔ اور اب مگن داس ساری جائداد کو تھی۔ علاقہ اور مکانات کا بلا شرکت غیرے مالک و مختار تھا۔ سیٹھانیوں میں خانہ جنگیاں ہو رہی تھیں۔ ملازموں نے غبن و خیانت کو اپنا وطیرہ بنا رکھا تھا۔ بڑی سیٹھانی اسے بلانے کے لئے خود آنے پر

آمادہ تھیں۔ مگر وکیل صاحب نے اُنہیں روکا تھا۔ جب مگن داس نے مسکرا کر پوچھا "تمہیں کیونکر معلوم ہُوا۔ کہ میں یہاں ہوں ہُئے تو وکیل صاحب نے فرمایا "مہینہ بھر سے تمہارے ہی سراغ میں ہوں۔ سیٹھ مکھن لال نے اتا پتہ بتلایا + تم دلی پہنچے۔ اور میں نے اپنا مہینہ بھر کا بل پیش کیا"+

رمبھا بیقرار تھی۔ کہ یہ کون ہے۔ اور ان میں کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ دس بجتے بجتے وکیل صاحب مگن داس سے ایک ہفتہ کے اندر آنے کا وعدہ لے کر رخصت ہوئے + اُسی وقت رمبھا آپہنچی اور پوچھنے لگی۔ "یہ کون تھا۔ ان کا تم سے کیا کام تھا"؟

مگن داس نے جواب دیا "جمراج کا دوت"+

رمبھا "کیا اشگون بکتے ہو"+

مگن۔ نہیں رمبھا یہ اشگون نہیں ہے۔ یہ سچ مچ میری موت کا فرشتہ تھا۔ میری خوشیوں کے باغ کو روندنے والا۔ میری ہری بھری کھیتی کو اُجاڑنے والا + رمبھا! میں نے تمہارے ساتھ دغا کی ہے۔ میں نے تمہیں اپنے فریب کے جال میں پھنسایا ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ محبت نے مجھ سے یہ سب کروایا۔ میں مگن سنگھ ٹھاکر نہیں ہوں۔ میں سیٹھ لگن داس کا بیٹا۔ اور سیٹھ مکھن لال کا داماد ہوں +

مگن داس کو خوف تھا۔ کہ رمبھا یہ سنتے ہی چونک پڑے گی۔ اور شاید اُسے ظالم۔ دغاباز کہنے لگے۔ مگر اُس کا خیال غلط نکلا۔ رمبھا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر صرف اتنا کہا۔ "تو کیا تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟"

مگن داس نے اُسے گلے لگا کر کہا۔ "ہاں"۔

رمبھا۔ کیوں؟

مگن۔ اس لئے کہ اندرا بہت ہوشیار حسین اور دولت مند ہے"۔

رمبھا۔ میں تمہیں نہ چھوڑوں گی۔ کبھی اندرا کی لونڈی تھی۔ اب اُن کی سوت بنوں گی۔ تم جتنی میری محبت کرو گے۔ اُتنی اندرا کی تو نہ کرو گے کیوں"؟

مگن داس اس بھولے پن پر متوالا ہو گیا۔ مسکرا کر بولا۔ اُب اندرا تمہاری لونڈی بنے گی۔ مگر سنتا ہوں۔ وہ بہت سندر ہیں۔ کہیں میں ان کی صورت پر لبھا نہ جاؤں۔ مردوں کا حال تم نہیں جانتیں مجھے اپنے ہی سے ڈر لگتا ہے"۔

رمبھا نے پر یقین نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "کیا تم بھی ایسا کرو گے؟ اُنہہ جو جی میں آئے کرنا۔ میں تمہیں نہ چھوڑوں گی۔ اندرا رانی بنتے میں لونڈی ہوں گی۔ کیا اتنے پر بھی مجھے چھوڑ دو گے"؟

مگن داس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ۔ بولا ۔ پیاری! میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے ۔ کہ دہلی نہ جاؤں گا ۔ یہ تو میں کہنے ہی نہ پایا ۔ کہ سیٹھ جی کا سرگباس ہو گیا ۔ بچہ اُن سے پہلے ہی چل بسا تھا ۔ افسوس سیٹھ جی کے آخری درشن بھی نہ کر سکا ۔ اپنا باپ بھی اتنی محبت نہیں کر سکتا ۔ اُنھوں نے مجھے اپنا وارث بنایا ہے ۔ وکیل صاحب کہتے تھے ۔ کہ سیٹھانیوں میں ان بن ہے ۔ نوکر چاکر لوٹ مار مچا رہے ہیں ۔ وہاں کا یہ حال ہے ۔ اور میرا دل وہاں جانے پر راضی نہیں ہوتا ۔ دل تو یہاں ہے ۔ وہاں کون جائے"۔

رمبھا ذرا دیر تک سوچتی رہی ۔ پھر بولی ۔ "تو میں تمہیں چھوڑ دوں گی ۔ اتنے دن تمہارے ساتھ رہی ۔ زندگی کا سکھ لوٹا ۔ اب جب تک جیوں گی ۔ اس سکھ کا دھیان کرتی رہوں گی ۔ مگر تم مجھے بھول تو نہ جاؤ گے ؟ سال میں ایک بار دیکھ لیا کرنا ۔ اور اسی جھونپڑے میں"۔

مگن داس نے بہت ضبط کیا ۔ مگر آنسو نہ تھم سکے ۔ بولے رمبھا یہ باتیں نہ کرو ۔ کلیجہ پھٹا جاتا ہے ۔ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا ۔ اس لئے نہیں ۔ کہ تمہارے اوپر کوئی احسان ہے ۔ تمہاری خاطر نہیں ۔ اپنی خاطر ۔ وہ راحت ۔ وہ محبت ۔ وہ آنند ۔ جو مجھے یہاں

میسر ہے۔ اَور کہیں نہیں مل سکتا۔ خوشی کے ساتھ زندگی بسر ہو۔ یہی انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ مجھے ایشور نے وہ خوشی یہاں دے رکھی ہے۔ تو مَیں اُسے کیوں چھوڑ دوں۔ مال و دولت کو میرا سلام ہے۔ مجھے اُس کی ہوس نہیں ہے"۔

رمبھا پھر متین لہجہ میں بولی۔ "مَیں تمہارے پاؤں کی بیڑی نہ بنوں گی۔ چاہے تم ابھی مجھے نہ چھوڑو۔ لیکن تھوڑے دنوں میں تمہاری یہ محبت نہ رہے گی"۔

مگن داس کو یہ تازیانہ لگا۔ جوش سے بولا "تمہارے سوا اس دل میں اب کوئی اور جگہ نہیں پا سکتا"۔

رات زیادہ آگئی تھی۔ اشٹمی کا چاند خواب گاہ میں جا چکا تھا دوپہر کے کنول کی طرح صاف و شفاف آسمان میں تارے کھلے ہوئے تھے۔ کسی کھیت کے رکھوالے کے بانسری کی آواز۔ جسے دوری نے تاثیر۔ سنّاٹے نے سریلا پن اور تاریکی نے روحانیت کی دلکشی بخشی تھی۔ کانوں میں آ رہی تھی۔ گویا کوئی مبارک روح ندی کے کنارے بیٹھی ہوئی۔ پانی کی لہروں سے یا دوسرے ساحل کے خاموش و پُرکشش درختوں سے اپنی زندگی کی داستان غم سنا رہی ہے۔

مگن داس سو گیا۔ مگر رمبھا کی آنکھوں میں نیند نہ آئی ۔

(۷)

صبح ہوئی۔ تو مگن داس اٹھا اور رمبھا! رمبھا! پکارنے لگا۔ مگر رمبھا رات ہی کو اپنی چچی کے ساتھ وہاں سے کہیں چلی گئی تھی ۔ مگن داس کو اس مکان کے در و دیوار پر ایک حسرت سی چھائی ہوئی معلوم ہوئی۔ گویا گھر کی جان نکل گئی تھی۔ وہ گھبرا کر اُس کوٹھڑی میں گیا۔ جہاں رمبھا روز چکی پیستی تھی۔ مگر افسوس! آج چکی بے حس و حرکت تھی۔ پھر وہ کنوئیں کی طرف دوڑا گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہُوا۔ کہ کنوئیں نے اُسے نگل جانے کے لئے اپنا منہ کھول دیا ہے۔ تب وہ بچوں کی طرح چیخ اٹھا۔ اور روتا ہُوا پھر اُسی جھونپڑی میں آیا۔ جہاں کل رات تک محبت کا باس تھا۔ مگر آہ! اُس وقت وہ ماتم کدہ بنی ہوئی تھی۔ جب ذرا آنسو تھمے تو اُس نے گھر میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ رمبھا کی ساڑی الگنی پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک پٹاری میں وہ کنگن رکھا ہُوا تھا۔ جو مگن داس نے اُسے دیا تھا۔ برتن سب رکھے ہوئے تھے صاف اور ستھرے۔ مگن داس سوچنے لگا" رمبھا تو نے رات کو کہا تھا میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔ کیا تو نے وہ بات دل سے کہی تھی ؟

میں نے تو سمجھا تھا۔ تو دل لگی کر رہی ہے۔ نہیں تو میں تجھے کلیجے میں چھپا لیتا۔ میں تو تیرے لئے سب کچھ چھوڑے بیٹھا تھا۔ تیری محبت میرے لئے سب کچھ تھی۔ آہ میں یوں بےچین ہوں۔ کیا تو بھی بےچین نہیں ہے؟ ہائے تو رو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ تو اب بھی لوٹ آئے گی۔" پھر مجسم تصورات کا ایک جمگھٹ اُس کے سامنے آیا۔ وہ نازک ادائیاں۔ وہ متوالی نگاہیں۔ وہ بھولی بھالی باتیں۔ وہ خود فراموشانہ مہر انگیزیاں۔ وہ جان بخش تبسم۔ وہ عاشقانہ دلجوئیاں۔ وہ پریم کا نشہ۔ وہ دائمی شگفتہ مزاجی۔ وہ لچک لچک کر کنوئیں سے پانی لانا۔ وہ صورت انتظار۔ وہ پرمحبت اضطراب۔ یہ سب تصویریں اُس کی نگاہوں کے سامنے حسرتناک بیتابی کے ساتھ پھرنے لگیں۔ مگن داس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور رقت و درد کے اُمڈتے ہوئے دریا کو مردانہ ضبط سے روک کر اٹھ کھڑا ہُوا۔ ناگ پور جانے کا قطعی فیصلہ ہو گیا۔ تکیہ کے نیچے سے صندوق کی کنجی اُٹھائی۔ تو کاغذ کا ایک ٹکڑا نکل آیا۔ یہ رمبھا کا الوداعی خط تھا۔

"پیارے میں بہت رو رہی ہوں۔ میرے پیر نہیں اُٹھتے۔ مگر میرا جانا ضروری ہے۔ تمہیں جگاؤں گی۔ تو تم جانے نہ دو گے۔

آہ! کیسے جاؤں! اپنے پیارے پتی کو کیسے چھوڑوں۔ قسمت مجھ سے یہ آنند کا گھر چھوڑا رہی ہے۔ مجھے بے وفا مت کہنا میں تم سے پھر کبھی ملوں گی۔ میں جانتی ہوں۔ کہ تم نے میرے لئے یہ سب کچھ تیاگ دیا ہے۔ مگر تمہارے لئے زندگی میں بہت کچھ اُمیدیں ہیں۔ میں اپنی محبت کی دھن میں تمہیں اُن امیدوں سے کیوں دور رکھوں۔ اب تم سے بدا ہوتی ہوں۔ میری سدھ مت بھولنا۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ یہ آنند کے دن کبھی نہ بھولیں گے۔ کیا تم مجھے بھول سکو گے؟

تمہاری پیاری پربھا

(۸)

مگن داس کو دہلی آئے تین مہینے گزر چکے ہیں۔ اس اثنا میں اُسے سب سے بڑا جو ذاتی تجربہ ہوا وہ یہ تھا۔ کہ فکرِ روزگار اور کثرت مشاغل سے جذبات سرکش کا زور کم کیا جا سکتا ہے۔ ڈیڑھ سال قبل کا بے فکر نوجوان اب ایک معاملہ فہم اور مآل اندیش انسان بن گیا تھا۔ ساگر گھاٹ کے چند روزہ قیام سے اُسے رعایا کی اُن تکالیف کا ذاتی علم ہو گیا تھا۔ جو کارندوں اور مختاروں

کی سخت گیریوں کی بدولت اُنہیں اُٹھانا پڑتی ہیں۔ اُس نے اُسے
ریاست کے انصرام میں بہت مدد دی۔ اور گو ملازمین دبی زبان
سے اس کی شکایت کرتے تھے۔ اور اپنی قسمتوں اور زمانے
کی نیرنگیوں کو کوستے تھے۔ مگر رعایا آسودہ حال تھی۔ ہاں جب وہ سب
دھندوں سے فرصت پاتا۔ تو ایک بھولی بھالی صورت والی نازنین
اُس کے پہلوئے خیال میں آ بیٹھتی۔ اور تھوڑی دیر کے لئے ساگر
گھاٹ کا وہ ہرا بھرا جھونپڑا اور اس کی دلفریبیاں آنکھوں کے
سامنے آجاتیں۔ ساری باتیں ایک دلکش خواب کی طرح یاد آ آ کر
اس کے دل کو مسوسنے لگتیں۔ لیکن کبھی کبھی خود بخود اس کا خیال
اندرا کی طرف بھی جا پہنچتا۔ گو اس کے دل میں رمبھا کی وہی جگہ
تھی۔ مگر کسی طرح اس میں اندرا کے لئے بھی ایک گوشہ نکل آیا
تھا۔ جن حالتوں اور آفتوں نے اسے اندرا سے بیزار کر دیا تھا۔
وہ اب رخصت ہو گئی تھی۔ اب اسے اندرا سے کچھ ہمدردی ہو گئی
تھی۔ اگر اُس کے مزاج میں غرور ہے۔ حکومت ہے۔ تکلف ہے
شان ہے۔ تو یہ اُس کا قصور نہیں۔ یہ رئیس زادوں کی عام کمزوریاں
ہیں۔ یہی اُن کی تعلیم ہے۔ وہ بالکل معذور و مجبور ہیں۔ ان متغیراور
معتدل جذبات کے ساتھ۔ جہاں وہ پیچیدگی کے ساتھ رمبھا کی یاد

کو تازہ کیا کرتا تھا - وہاں اندرا کا خیر مقدم کرنے - اور اُسے اپنے
دل میں جگہ دینے کے لئے تیار تھا + وہ دن بھی دور نہیں تھا جب
اُسے اس آزمائش کا سامنا کرنا پڑے گا - اس کے کئی عزیز امیرانہ شان
و شکوہ کے ساتھ اندرا کو رخصت کرانے کے لئے ناگپور گئے ہوئے تھے +
مگن داس کی طبیعت آج گوناگوں جذبات کے باعث جن میں انتظار
اور اشتیاق کی حیثیت نمایاں تھی - اُچاٹ سی ہو رہی تھی - جب
کوئی ملازم آتا تو وہ سنبھل بیٹھتا - کہ شاید اندرا آ پہنچی - آخر شام
کے وقت جب دن اور رات گلے مل رہے تھے - زنانخانہ میں نغمۂ
پُرشور کی صداؤں نے بہو کے پہنچنے کی اطلاع دی + سہاگ کی سہانی
رات تھی - دس بج گئے تھے - پرفضا صحن میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی
وہ چاندنی جس میں نشہ ہے - آرزو ہے - اور کشش ہے - گملوں میں
کھلے ہوئے گلاب اور چمپے کے پھول - چاند کی سُنہری روشنی میں
زیادہ متین اور خاموش نظر آتے تھے - مگن داس اندرا سے ملنے
کے لئے چلا + اس کے دل میں آرزوئیں ضرور تھیں - مگر حسرتناک
شوق دیدار تھا - مگر تشنگی سے خالی محبت نہیں - نفس کی کشش تھی -
جو اُسے کھینچے لئے جاتی تھی + اُس کے دل میں بیٹھی ہوئی رمبھا شاید
بار بار باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی - اسی لئے دل میں دھڑکن

ہورہی تھی۔ وہ خواب گاہ کے دروازہ پر پہنچا۔ ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔ اُس نے پردہ اٹھا دیا۔ اندر ایک عورت سفید ساڑھی پہنے کھڑی تھی۔ ہاتھ میں چند خوشنما چوڑیوں کے سوا اس کے بدن پر ایک زیور بھی نہ تھا جوں ہی پردہ اُٹھا۔ اور مگن داس نے اندر قدم رکھا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ مگن داس نے اُسے دیکھا۔ اور متحیر ہو کر بولا۔ "رمبھا! اور دونوں بیتابانہ جوش سے باہم لپٹ گئے۔ دل میں بیٹھی ہوئی رمبھا باہر نکل آئی تھی۔

سال بھر گزرنے کے بعد ایک دن اندرا نے اپنے شوہر سے کہا۔ "کیا رمبھا کو بالکل بھول گئے۔ کیسے بے وفا ہو۔ کچھ یاد ہے۔ اُس نے چلتے وقت تم سے کیا التجا کی تھی؟ مگن داس نے کہا۔ "خوب یاد ہے۔ وہ آواز ابھی کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں رمبھا کو بھولی بھالی لڑکی سمجھتا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا۔ کہ یہ تریا چرتر کا طلسم ہے۔ میں اپنی رمبھا کو اب بھی اندرا سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ تمہیں رشک تو نہیں ہوتا؟" اندرا نے ہنس کر جواب دیا۔ "رشک کیوں ہو؟ تمہیں رمبھا ہے تو کیا میرا مگن سنگھ نہیں ہے؟ میں اب بھی اس پر مرتی ہوں۔" دوسرے دن دونوں دہلی سے ایک قومی جلسے میں شریک ہونے کا بہانہ کر کے روانہ ہو گئے۔ اور ساگر گھاٹ جا پہنچے۔ وہ

امرت

(۱)

میرا عنفوانِ شباب تھا۔ جب میرا دل لذتِ درد سے مانوس ہُوا۔ کچھ دنوں تک مشقِ سخن کرتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ اس شوق نے محویت کی صورت اختیار کر لی + سارے دنیاوی تعلقات سے منہ موڑ کر اپنے حسنِ فکر کی پناہ میں آ بیٹھا۔ اور تین ہی سال کی مشق نے میری فکر کے جوہر کھول دیئے + کبھی کبھی میرا کلام اساتذہ کے مشہور کلام سے ٹکر کھا جاتا تھا۔ میرے قلم نے کسی اُستاد کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ میرا خیال ایک خودرو پودے کی طرح قطع و برید کی قیدوں سے آزاد نشو و نما پاتا رہا۔ اور میرے کلام کا انداز بالکل نرالا تھا۔ مَیں نے اپنی شاعری کو فارس سے نکال کر یورپ تک پہنچا دیا۔ یہ میرا اپنا رنگ تھا۔ اس میدان میں نہ میرا کوئی رقیب تھا۔ نہ ہمسر۔

باوجود اس شاعرانہ محویت کے مجھے شاعروں کی واہ واہ اور سبحان اللہ سے نفرت تھی۔ ہاں اہل ذوق سے بلا اپنا نام بتلائے ہوئے اکثر اپنے کلام کے حسن و قبح پر بحث کیا کرتا + گو مجھے دعویٰ شاعری نہ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ مجھے شہرت سے نیاز ہونے لگا۔ اور جب میری مثنوی "دنیائے حسن"۔ شائع ہوئی تو دنیائے ادب میں ہلچل سی مچ گئی۔ شعرائے سلف نے سخن فہموں کی بخل داد میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دئیے ہیں۔ مگر میرا تجربہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ مجھے کبھی کبھی یہ خیال ستایا کرتا۔ کہ میرے قدردانوں کی یہ فیاضی دیگر شعرا کے پستی فکر کی دلیل ہے۔ یہ خیال حوصلہ شکن تھا بہرحال جو کچھ ہوا۔ دنیائے حسن نے مجھے قلمرو سخن کا بادشاہ بنا دیا + میرا نام ہر ایک زبان پر تھا۔ میرا چرچا ہر ایک اخبار میں تھا۔ شہرت اپنے ساتھ دولت بھی لائی۔ مجھے شب و روز بجز فکر سخن کے اور کوئی شغل نہ تھا۔ بسا اوقات بیٹھے بیٹھے راتیں گزر جاتیں۔ اور جب کوئی چبھتا ہوا شعر قلم سے نکل جاتا تو میں فرط مسرت سے اچھل پڑتا۔ میں اب تک تاہل کے قیود سے آزاد تھا۔ یا یوں کہئے۔ کہ میں اس کے ان مزوں سے غیر مانوس تھا۔ جن میں رنج کی تلخی بھی ہے۔ اور نشاط کی نمکینی بھی۔ اکثر مغربی ادیبوں کی طرح میرا بھی خیال تھا۔ کہ سودائے سخن اور سودائے حسن

میں پرانا ہیرے ہے + مجھے اپنی زبان سے کہتے ہوئے نادم ہونا پڑتا ہے۔
کہ مجھے اپنی طبیعت پر بھروسہ نہ تھا۔ جب کبھی میری آنکھوں میں
کوئی دلفریب صورت کھب جاتی۔ تو میرے دل و دماغ پر ایک
جنون سا طاری ہو جاتا۔ ہفتوں تک ایک خود فراموشی کا سا عالم رہتا
فکر سخن کی طرف طبیعت کسی طرح مائل نہ ہوتی۔ ایسے کمزور دل میں
صرف ایک عشق کی جگہ تھی۔ اسی خوف سے میں اپنی رنگین طبیعت
کے خلاف ثقہ بننے پر مجبور تھا + کنول کی ایک پنکھڑی۔ شیاما کے ایک
نغمہ۔ لہلہاتے ہوئے ایک مرغزار میں میرے لئے جادو کی سی کشش
تھی۔ مگر کسی نازنین کے دلفریب حسن کو میں مصور یا پیکر تراش کی
سی لوث نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتا تھا حسین عورت میرے لئے
ایک خوش رنگ زہر ناک ناگن تھی۔ جسے دیکھ کر آنکھیں خوش ہوتی ہیں
مگر دل خوف سے سمٹ جاتا ہے +

خیر ہیا ہے حسن کو شائع ہوئے دو سال گزر چکے تھے۔ میری
شہرت برسات کی امڈی ہوئی ندی کی طرح بڑھتی چلی جاتی تھی۔ ایسا
معلوم ہوتا تھا۔ گویا میں نے دنیائے ادب پر کوئی عمل تسخیر کر دیا ہے +
اس دوران میں میں نے متفرق اشعار تو بہت کہے۔ مگر دعوتوں
اور ایڈریسوں کے ہجوم نے جذبات لطیف کو ابھرنے نہ دیا۔ نمود

اور شہرت ایک مدبر کے سمند ناز کے لئے تازیانہ کا کام دے سکتے ہیں۔ مگر شاعر کی طبیعت کچھ گوشۂ عافیت ہی میں جولان پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ میں ان روز افزوں مکروہات سے گلا چھڑا کر بھاگا اور کوہستان کے ایک گوشہ میں جا چھپا۔ "نیرنگ" نے وہیں جنم لیا ×

(۲)

نیرنگ کے شروع کرتے ہی مجھے ایک حیرت انگیز اور خاطر شکن تجربہ ہوا۔ خدا معلوم کیوں میرے ذہن اور فکر پر ایک پردہ پڑ گیا۔ گھنٹوں طبیعت پر زور ڈالتا۔ مگر ایک شعر بھی ایسا نہ نکلتا۔ کہ دل پھڑک اٹھے۔ سوجھتے بھی تو پامال۔ پادر افتادہ مضامین۔ جن سے میری روح بھاگتی تھی ۔ میں اکثر جھنجلا کر اٹھ بیٹھتا۔ کاغذ پھاڑ ڈالتا۔ اور نہایت بیدلی کے عالم میں سوچنے لگتا۔ کہ کیا میری شاعرانہ قوتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ کیا میں نے وہ خزانہ جو قدرت نے مجھے مدت العمر کے لئے عطا کیا تھا۔ اپنا جلد لٹا دیا؟ کجا وہ عالم تھا کہ مضامین کی بہتات اور نازک خیالات کی فراوانی قلم کو دم نہیں لینے دیتی تھی۔ طائر فکر اڑتا تو آسمان میں تارا بن جاتا تھا۔ اور کہاں اب یہ پہنچی! یہ افسوسناک بے مائیگی۔ مگر اس کا سبب کیا ہے؟ یہ کس قصور کی سزا ہے؟ اسباب نتائج کا دوسرا نام دیتا ہے۔ جب تک ہم کو کیوں کا جواب نہ

ملے۔ دل کو کسی طرح صبر نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ موت کو بھی اس کیوں کا جواب دینا پڑتا ہے۔ آخر میں نے ایک ڈاکٹر سے مشورہ لیا۔ اُس نے عام ڈاکٹروں کی طرح تبدیل آب و ہوا کی صلاح دی۔ میرے ذہن میں بھی یہ بات آئی۔ کہ ممکن ہے۔ نینی تال کی مرطوب آب و ہوا سے شعلۂ فکر ٹھنڈا پڑ گیا ہو۔ چھ مہینہ تک مسلسل سیر و سیاحت کرتا رہا۔ دلکش مناظر بہت دیکھے۔ مگر ان سے روح پر وہ شاعرانہ کیفیت نہ طاری ہوتی تھی۔ کہ پیمانہ چھلک پڑے۔ اور فکر خاموش خود بخود چہکنے لگے۔

مجھے اپنا کھویا ہوا لال نہ ملا۔ اب میں زندگی سے بیزار تھا۔ زندگی اب مجھے خشک ریگستان سی معلوم ہوتی تھی۔ جہاں کوئی جان نہیں۔ تازگی نہیں۔ دلچسپی نہیں؟ ہر دم دل پر مایوسانہ دل گرفتگی مسلط رہتی۔ دل میں یہ سوال پیدا ہوتا۔ کہ کیا وہ چار دن کی چاندنی ختم ہو گئی۔ اور اندھیرا پاکھ آ گیا۔ انسان کی صحبت سے بیزار ہم جنس کی صورت سے نفور۔ میں ایک گوشہ گمنام میں پڑا ہوا حیات کے دن پورے کر رہا تھا۔ درختوں کی بلندیوں پر بیٹھنے والی۔ میٹھے راگ گانے والی چڑیا کیا قفس میں زندہ رہ سکتی ہے؟ ممکن ہے۔ کہ وہ دانہ کھائے پانی پیئے۔ مگر اس کی اس زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

آخر جب مجھے اپنے بازیافت کی کوئی امید نہ رہی تو میرے

دل میں یہ ارادہ مصمم ہو گیا۔ کہ اب میرے لئے دنیاءِ سخن سے مر جانا ہی بہتر ہو گا۔ مردہ تو ہوں ہی۔ اس حالت میں اپنے تئیں زندہ سمجھنا حماقت ہے + آخر میں نے ایک روز چند روزانہ اخباروں کو اپنے مرنے کی خبر دے دی + اس کے شائع ہوتے ہی ملک میں کہرام مچ گیا۔ ایک تہلکہ پڑ گیا۔ شور و شیون کی صدائیں بلند ہوئیں + اس وقت مجھے اپنی عام حسن قبول کا کچھ اندازہ ہوا + یہ عام صدا تھی۔ کہ دنیاءِ سخن کی کشتی منجدھار میں ڈوب گئی۔ بزم سخن درہم برہم ہو گئی۔ اخباروں اور رسالوں میں میرے سوانحی حالات شائع ہوئے۔ جن کو پڑھ کر مجھے ان ایڈیٹروں کے مادۂ ایجاد کا قائل ہونا پڑا + نہ تو میں کسی رئیس کا فرزند اکبر تھا۔ اور نہ میں نے مسند ریاست چھوڑ کر فقیری اختیار کی تھی۔ اُن کا حسن ظن حقیقت حال پر غالب آ گیا تھا + میرے احباب میں ایک صاحب نے جنہیں مجھ سے مراسم یگانگت کا دعویٰ تھا۔ مجھے شیشہ و ساغر کا شیدائی بنا دیا تھا۔ وہ جب کبھی مجھ سے ملتے انہیں میری آنکھیں نشہ سے سُرخ نظر آتیں۔ اگرچہ اسی مضمون میں آگے چل کر انہوں نے میری اس مکروہ عادت کی بہت کشادہ دلی سے توجیہ کی تھی کیونکہ زاہد خشک ایسے رندانہ اور مستانہ اشعار نہیں کہہ سکتا تھا۔ تاہم یہ حیرت ہے۔ کہ انہیں صریح غلط بیانی کی کیونکر جرأت

ہوئی +

خیر۔ ان غلط بیانیوں کی تو مجھے پروا نہ تھی ۔ البتہ یہ بڑی فکر تھی ۔ فکر نہیں ایک پُرزور تمنا ۔ کہ میرے کلام پر زبان خلق سے کیا فتویٰ صادر ہوتا ہے + ہمارے کارنامہ زندگی کی سچی داد مرنے کے بعد ہی ملتی ہے ۔ کیونکہ اس وقت وہ خوشامد اور خباثت کی آلودگیوں سے پاک ہوتی ہے ۔ مرنے والے کی خوشی یا رنج کی کون پروا کرتا ہے؟ اس لئے میرے کلام پر جتنی تنقیدیں نکلیں ۔ میں نے اُن کا بہت ہی ٹھنڈے دل سے مطالعہ شروع کیا ۔ مگر شاعرانہ نگاہ کی وسعت اور مذاق کی لطافت کا ہر چہار طرف قحط سا معلوم ہوتا تھا ۔ زیادہ تر جوہریوں نے اشعار سے فرداً فرداً بحث کی تھی ۔ اور اس میں شک نہیں ۔ کہ وہ قاری کی حیثیت سے اس شعر کے پہلوؤں کو خوب سمجھتے تھے ۔ مگر نقاد کا کہیں پتہ نہ تھا ۔ نظر عمیق غائب تھی + کلام پر مجموعی حیثیت سے نگاہ کرنے والا ۔ شاعر کے اندرونی جذبات تک پہنچنے والا کوئی مبصر نہ دکھائی دیا +

(۳۲)

ایک روز میں عالم ارواح سے نکل کر گھومتا ہوا اجمیر کی پبلک لائبریری میں جا پہنچا + دوپہر کا وقت تھا ۔ میں نے میز پر جھک کر

دیکھا۔ کہ کوئی تازہ تصنیف ہاتھ آجائے۔ تو دل بہلاؤں۔ دفعتہً میری نگاہ ایک دیدہ زیب رسالے کی طرف گئی۔ جس کا عنوان تھا "کلام اختر" جیسے بھولا بچہ کھلونے کی طرف لپکتا ہے۔ اسی طرح جھپٹ کر میں نے اس کتاب کو اٹھا لیا + اس کی مصنفہ مس عائشہ عارف تھیں + دلچسپی اور بھی زیادہ ہوئی۔ میں اطمینان سے بیٹھ کر۔ اس کتاب کو پڑھنے لگا + ایک ہی صفحہ پڑھنے کے بعد دلچسپی نے بیتابی کی صورت اختیار کی۔ پھر تو میں ایک عالم استغراق میں تھا۔ میرے سامنے گویا معنی اور نکات کا ایک دریا لہریں مار رہا تھا۔ خیالات کی نوعیت۔ مذاق کی پاکیزگی۔ زبان کی لطافت۔ شاعرانہ نگاہ کی وسعت کس کی تعریف کروں۔ اس کا ایک ایک خیال خیال آفرین تھا۔ میں ایک پیراگراف پڑھتا۔ پھر تازگی خیال سے متاثر ہو کر ایک لمبی سانس لیتا۔ اور تب سوچنے لگتا۔ اس کتاب کو سرسری طور پر پڑھنا غیر ممکن تھا۔ یہ عورت تھی یا حسن مذاق کی دیوی۔ اس کی تعریف سے میرا کلام بہت کم بچا تھا۔ مگر جہاں اس نے مجھے داد دی تھی۔ وہاں رموز او حقیقت کے موتی برسا دیئے تھے + اس کے اعتراضات میں ہمدردی اور داد میں عقیدت تھی۔ شاعر کے کلام کو عیوب کے اعتبار سے نہیں۔ خوبیوں کے اعتبار

سے دیکھنا چاہئے۔ اس نے کیا نہیں کیا۔ یہ صحیح معیار نہیں۔ اس نے کیا کیا یہ صحیح معیار ہے + بس یہی جی چاہتا تھا۔ کہ مُصنفہ کے ہاتھ اور قلم کو چوم لے + "سفیر" بھوپال کے دفتر سے یہ رسالہ شائع ہُوا تھا۔ میرا ارادہ مصمم ہوگیا۔ تیسرے دن شام کے وقت میں مس عائشہ کے خوب صورت بنگلہ کے سامنے ہری ہری گھاس پر ٹہلتا تھا +

میں خادمہ کے ساتھ ایک کمرہ میں داخل ہُوا۔ اُس کی سجاوٹ بہت سادہ تھی۔ پہلی چیز جس پر میری نگاہ پڑی۔ وہ میری تصویر تھی جو دیوار سے لٹک رہی تھی۔ سامنے ایک آئینہ رکھا ہُوا تھا + مَیں نے خدا معلوم کیوں اس میں اپنی صورت دیکھی + میرا چہرہ زرد اور افسردہ تھا۔ بال اُلجھے ہوئے۔ کپڑوں پر گرد کی ایک موٹی تہ جمی ہوئی۔ پریشانی کی زندہ تصویر کھڑی تھی۔ اس وقت مجھے اپنی ہیئت کذائی پر سخت ندامت ہوئی۔ میں تو جیسا نہ سہی۔ مگر اس وقت تو سچ مچ چہرہ پر پھٹکار برس رہی تھی۔ اپنے لباس کی موزونیت کا یقین ہمیں بشاش اور شگفتہ بنا دیتا ہے۔ اپنے پھوہڑپن کا جسم پر اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا دل پر۔ ہم بزدل اور بے حوصلہ ہو جاتے ہیں +

مجھے مشکل سے پانچ منٹ گزرے ہوں گے۔ کہ مس عائشہ تشریف لائیں + سانولا رنگ تھا۔ چہرہ ایک متین ملاحت سے منور تھا۔ بڑی بڑی نرگسی آنکھوں سے اخلاقی تہذیب کی روشنی جھلکتی تھی۔ قد میانہ سے کچھ کم۔ اعضا سبک۔ ایسی ہلکی پھلکی گویا قدرت نے اس مادی دنیا کے لئے نہیں کسی ہوائی کرہ کے لئے اسے خلق کیا ہے + کوئی مصور فطانت کی اس سے بہتر تصویر نہیں کھینچ سکتا تھا +

مس عائشہ نے میری طرف دبی نگاہوں سے دیکھا۔ مگر دیکھتے دیکھتے اس کی گردن جھک گئی۔ اور اس کے رخساروں پر شرم کی ایک ہلکی سی پرچھائیں ناچتی ہوئی معلوم ہوئی۔ زمین سے اٹھ کر اس کی آنکھیں میری تصویر کی طرف گئیں۔ اور پھر سامنے پردہ کی طرف جا پہنچیں۔ شاید اس کی آڑ میں چھپنا چاہتی تھیں +

مس عائشہ نے میری طرف دبی نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔

"آپ اختر مرحوم کے عزیزوں میں ہیں"؟

میں نے سر نیچا کئے ہوئے جواب دیا "میں ہی بدنصیب اختر ہوں"+

عائشہ ایک بیخودی کے عالم میں کرسی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور میری طرف انداز تحیر سے دیکھ کر بولی "دنیائے حسن کے مصنف"!
اعتقادِ ضعیف کے سوا رفتگانِ عدم کو کس نے دیکھا ہے عائشہ نے میری طرف کئی بار مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ ان میں اب شرم اور حیا کے بجائے حیرت سمائی ہوئی تھی۔ میرے قبر سے نکل کر بھاگ گئے کا تو اسے یقین آ ہی نہیں سکتا تھا۔ شاید وہ مجھے دیوانہ سمجھ رہی تھی + اُس نے دل میں فیصلہ کیا۔ کہ یہ شخص مرحوم شاعر کا کوئی قریبی عزیز ہے۔ خاندانی مشابہت اس کی شاہد تھی۔ ممکن ہے کہ بھائی ہو۔ اس ناگہانی صدمہ سے ازخود رفتہ ہوگیا ہے۔ شاید اس نے میری کتاب دیکھی ہوگی + اور دریافت حال کے لئے چلا آیا ہے۔ دفعتہً اُسے خیال گذرا۔ کہ کسی نے اخباروں کو میرے مرنے کی جھوٹی خبر دے دی ہو۔ اور مجھے اس کی تردید کا موقع نہ ملا ہو۔ اس خیال سے اُس کی اُلجھن دور ہوئی۔ بولی "اخباروں میں آپ کے متعلق ایک نہایت منحوس خبر شائع ہوگئی تھی"۔ میں نے جواب دیا "وہ خبر صحیح تھی"۔

اگر پہلے عائشہ کو میرے دیوانہ پن میں کچھ شک تھا۔ تو وہ رفع ہوگیا۔ اس کے بعد تب اُن سے مجھے حظ حاصل ہوتا تھا۔ آخر میں نے مختصر الفاظ میں اپنی داستان سنائی۔ اور جب اس کو یقین

ہوگیا۔ کہ دنیاءِ حسن کا مُصنّف اختر اپنے انسانی قالب میں ہے۔ تو اُس کے چہرہ پر مسرت اور انبساط قلب کی ایک ہلکی سرخی دکھائی دی۔ اور یہ ہلکا رنگ بہت جلد خودداری اور غرورِ حُسن کے شوخ رنگ سے متغیّر ہوگیا۔ غالبًا وہ نادم تھی۔ کہ کیوں اُس نے اپنی قدردانی کو دائرہ اعتدال سے باہر جانے دیا۔ کچھ دیر کی شرمیلی خموشی کے بعد اُس نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ کہ آپ کو ایسی نامبارک خبر شائع کرنے کی ضرورت ہوئی"۔

میں نے پرجوش انداز سے جواب دیا۔ "آپ کے زبان قلم سے داد پانے کی کوئی دوسری صورت نہ تھی۔ اس تنقید کے لئے میں ایسی ایسی کئی موتیں مرسکتا تھا"۔

میرے اس دلیرانہ انداز نے عائشہ کی زبان کو بھی تکلّف اور کھچاؤ کی قید سے آزاد کیا۔ مُسکرا کر بولی۔ "مجھے تصنع مرغوب نہیں ہے۔ ڈاکٹروں نے کچھ تشخیص نہیں کی؟" اس کے اس تبسم نے مجھے بذلہ سنجی پر آمادہ کیا۔ بولا۔ "اب مسیح کے سوا اس مرض کی شفا اور کسی کے ہاتھوں نہیں ہوسکتی"۔

عائشہ کنایہ سمجھ گئی۔ ہنس کر بولی۔ "مسیح چوتھے آسمان پر رہتے ہیں"۔

میری ہمت نے اب اَور قدم بڑھائے "عالم ارواح سے چوتھا آسمان بہت دور نہیں ہے"۔

عائشہ کے شگفتہ چہرہ سے متانت اور اجنبیت کا ہلکا رنگ اڑ گیا۔ تاہم میرے ان دلیرانہ کنایوں کو اخلاق کی حد سے بڑھتے دیکھ کر اسے میری زبان کو محتاط بنانے کے لئے کسی قدر خودداری برتنا پڑی۔ جب میں کوئی گھنٹہ بھر کے بعد اس کمرہ سے نکلا۔ تو بجائے اس کے کہ وہ میری طرف اپنی انگریزی تہذیب کے مطابق ہاتھ بڑھائے اس نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ پھیلا ہُوا پانی جب سمٹ کر کسی گزرگاہ سے نکلتا ہے۔ تو اُس کا بہاؤ بہت تیز اور طاقت بدرجہا زیادہ ہو جاتی ہے۔ عائشہ کی اُن نگاہوں میں عصمت کی تاثیر تھی۔ ان میں دل مسکراتا تھا۔ اور جذبہ ناچتا تھا۔ آہ! ان میں میرے لئے دعوت کا ایک پُرجوش پیغام بھرا ہُوا تھا۔ جب میں مسلم ہوٹل میں پہنچ کر ان واقعات پر غور کرنے لگا۔ تو میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ گو میں بصورت ظاہر یہاں اب تک غیر مانوس تھا۔ لیکن معنوی حیثیت سے شاید مجھے گوشۂ دل تک رسائی حاصل ہو چکی تھی۔

(۴)

جب میں کھانا کھا کر پلنگ پر لیٹا تو باوجود دو دن کی شب بیداری کے نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جذبات کی کشمکش میں نیند کہاں! عائشہ کی صورت۔ اُس کی خاطر داریاں اور اُس کی وہ دزدیدہ نگاہ دل میں احساسات اور واردات کا طوفان سا برپا کر رہی تھی۔ اُس آخری نگاہ نے دل میں تمناؤں کی دھوم دھوم مچا دی۔ وہ آرزوئیں جو بہت عرصہ ہوا مر مٹی تھیں۔ پھر بیدار ہوئیں اور آرزوں کے ساتھ فکر نے بھی مُندی ہوئی آنکھیں کھول دیں۔ دل میں جذبات اور کیفیات کا ایک نیا بے چین کرنے والا جوش محسوس ہوا۔ یہی آرزوئیں۔ یہی بے چینیاں اور یہی شورشیں شمع فکر کے لئے روغن ہیں۔ جذبات کی حرارت نے فکر کو گرمایا۔ میں قلم لے کر بیٹھ گیا۔ اور ایک ایسی نظم لکھی جسے میں اپنا سرمایۂ ناز سمجھتا ہوں۔

میں ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ مگر کسی نہ کسی حیلہ سے دن میں کم سے کم ایک بار ضرور لُطف دیدار اُٹھاتا۔ گو عائشہ نے کبھی میرے قیام گاہ تک آنے کی تکلیف نہیں کی۔ تاہم مجھے یہ یقین کرنے کے لئے شہادتوں کی ضرورت نہ تھی۔ کہ وہاں کسی قدر سرگرمی سے میرا انتظار کیا جاتا تھا۔ میرے قدموں کی مانوس

آہٹ پاتے ہی اس کا چہرہ کنول کی طرح شگفتہ ہوجاتا تھا۔ اور آنکھوں سے تمنا خیز شعاعیں نکلنے لگتی تھیں + یہاں چھ مہینے گزر گئے۔ اس زمانہ کو میری زندگی کی بہار سمجھنی چاہیئے۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں۔ جب میں آرزوں اور حسرتوں کے غم سے آزاد تھا۔ مگر دریا کی پرسکون روانی میں تھرکتی ہوئی لہروں کی بہار کہاں؟ اب اگر محبت کا درد تھا۔ تو اس کا جان بخش مزہ بھی تھا۔ اگر آرزوؤں کی جانگدازیاں تھیں۔ تو اُن کے ولولے بھی تھے + آہ! میری یہ پیاسی آنکھیں اس چشمۂ حسن سے کسی طرح سیر نہ ہوتیں۔ جب میں اپنی مخمور آنکھوں سے اُسے دیکھتا۔ تو مجھے ایک جان نواز روحانی طراوت کا احساس ہوتا۔ میں سرورِ دیدار سے بے کیف و بیخود ہوجاتا اور گرمیٔ فکر کا تو کچھ حد و حساب نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا دل میں جذباتِ شیریں کا سوتا کھل گیا تھا۔ اپنی شاعرانہ قدرت اور مضمون آفرینی پر خود حیرت ہوتی تھی۔ قلم ہاتھ میں لیا اور مضامین کا سرچشمہ سا بہہ نکلا۔ "نیرنگ" میں بلند خیالیاں نہ ہوں۔ عمق نہ ہو۔ مگر اس کا ایک ایک شعر روانی اور لطافت۔ گرمی و گداز کی داد دے رہا ہے + یہ اُس شمع کی برکت تھی۔ جو اب میرے دل میں روشن ہوگئی تھی +

یہ اس پھول کی مہک تھی۔ جو میرے دل میں کھلا ہُوا تھا۔
محبت روح کی غذا ہے۔ یہ وہ امرت کی بوند ہے۔ جو مرے ہوئے
جذبات کو زندہ کر دیتی ہے۔ محبت روحانی نعمت ہے۔ یہ زندگی
کی سب سے پاک۔ سب سے اعلےٰ۔ سب سے مبارک برکت ہے
یہی اکسیر تھی۔ جس کی مجھے نادانستہ تلاش تھی۔ وہ رات کبھی نہ بھولے
گی۔ جب عائشہ دلہن بنی ہوئی۔ میرے گھر میں آئی "نیرنگ" اسی
مُبارک زندگی کی یادگار ہے۔ "دنیائے حُسن" ایک غنچہ تھی۔ "نیرنگ" شگفتہ
وشاداب پھول ہے۔ اور اس غنچہ کو کھلانے والی کون سی چیز ہے؟
وہی جس کی مجھے نادانستہ تلاش تھی۔ اور جسے میں اب پا گیا تھا۔

شکاری راجکمار

شکاری راجکمار

(۱)

مئی کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا۔ آفتاب کی آنکھیں سامنے سے ہٹ کر سر پر جا پہنچی تھیں۔ اس لئے اُن میں مروت نہ تھی معلوم ہوتا تھا۔ کہ زمین اُس کے خوف سے کانپ رہی ہے + اسی گرمی اور شعلہ کے بیچ میں ایک شکاری ایک ہرن کے پیچھے مجنونانہ جوش کے ساتھ گھوڑا بڑھائے چلا آتا تھا + شکاری کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ اور گھوڑا پسینے میں شل۔ لیکن ہرن سایہ آرزو کی طرح چھلانگیں مارتا۔ نالیوں اور جھاڑیوں پر اُڑتا چلا جاتا تھا۔ اُس کے پیر زمین پر نہیں ہوا پر اُٹھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ زندگی اور موت کی دوڑ تھی +

پچھوا ہوا رہ رہ کر ڈراؤنی آواز سے گرجتی۔ غبار کے بادل

ساتھ لئے آگ اور شعلے برساتی تھی۔ گھوڑے کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اور سوار کی رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ لیکن ہرن کے کاوے اسے بندوق سنبھالنے تک کا موقع نہ دیتے تھے۔ اودکھ کے لہراتے ہوئے کھیت آئے۔ اور چھوٹ گئے۔ ڈھاک کا جنگل دکھائی دیا۔ اور پیچھے رہ گیا۔ پہاڑیاں نظر آئیں اور کچھ دور ساتھ چل کر غائب ہو گئیں۔ یہ سب نظارے نقش باد کی طرح مٹتے چلے جاتے تھے۔

لمحہ بہ لمحہ اور قدم بہ قدم ہرن اور سوار کے درمیان فاصلہ بڑھتا جاتا تھا۔ دفعتاً ہرن پیچھے کی طرف مڑا۔ سامنے دیوار کی طرح سیدھے کراروں کی آڑ میں ایک ندی لہریں لے رہی تھی۔ راہ فرار بند تھی۔ کرار پر سے نیچے کودنا موت کے منہ میں کودنا تھا۔ ہرن کے اعضا سست پڑ گئے۔ اس نے تلملائی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ موت کی ڈراؤنی صورت چاروں طرف منڈلاتی ہوئی نظر آئی۔ شکاری کے لئے اتنی مہلت کافی تھی۔ موت نے فتح کی خوشی میں ایک دل ہلانے والا نعرہ مارا + ایک شعلہ پیدا ہوا۔ اور ہرن زمین پر لوٹ گیا۔

(۳)

ہرن زمین پر تڑپ رہا تھا۔ اور شکاری کی آنکھوں سے سفاکانہ مسرت کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ گویا اُس نے آج وہ کام کیا ہے جس پر فرشتوں کو بھی ناز ہو سکتا ہے + اُس نے ہرن کو بالشت سے ناپا۔ اور تب اُس کے شاندار سینگوں کو اطمینان سے دیکھا + اس قد و قامت کا ہرن شاید ہی کسی کے ہاتھ آیا ہو۔ اس کے سینگوں سے کمرہ کی زینت دوچند ہو جائے گی۔ اور اُس کی دل فریب کھال تو آنکھوں کے لئے واقعی ایک ضیافت ہو گی +

اب اُسے دھوپ کی تیزی کا احساس ہُوا۔ بدن کے ایک ایک مسام سے شرارے نکل رہے تھے۔ اس نے ہوسناک نگاہوں سے ندی کی طرف دیکھا۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی ایسا درخت بھی نہیں تھا۔ جس کے سایہ میں بیٹھ کر ذرا دم لے لیتا +

دفعتاً کرارے کے نیچے سے ایک کشیدہ قامت آدمی جست مار کر اوپر آیا۔ اور اُس کے روبرو کھڑا ہو گیا + شکاری نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ ایسا خوش قامت خوش رو انسان آج تک اُن کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ اُس کے سڈول جسم اور

مردانہ حسن پرجادو طراز مصوّر شاعر بن سکتا تھا۔ اور سحر بیان شاعر مصوّر۔ اُس کی صفائی باطن اُس کے چہرہ پر۔ اور اس کی آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے۔ کہ وہ ایک ہمت کا مضبوط۔ آہنی ارادہ اور استقلال کا آدمی ہے۔ یاس اور ناکامی اور خوف سے بیگانہ۔ دامن کوہ کے اس تنادر درخت کی طرح جو آندھی اور طوفان اور شورش میں جھومتا ہے۔ مگر گرتا نہیں ٭

مگر سنیاسی نے ہرن کو دیکھ کر متانت آمیز آزادی سے کہا " راجکمار! نہیں آج بہت اچھا شکار ہاتھ لگا۔ ایسے ڈیل ڈول کا ہرن اس جوار میں شاید ہی ہو" ٭

راجکمار کو تعجب ہوا۔ کہ یہ فقیر مجھے کیونکر پہچان گیا۔ میں نے تو اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ اُس کی آزادی میں وہ فطری رنگ نمایاں تھا۔ جس پر نخوت یا سوء ادب کا گمان نہیں ہو سکتا۔ بولے جی "ہاں میرا بھی ایسا ہی خیال ہے۔ میں نے اپنی شکاری زندگی میں ایسا ہرن نہیں دیکھا۔ لیکن اس کی بدولت آج مجھے بڑی تکلیف ہوئی" ٭

سنیاسی نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ "بے شک تمہیں تکلیف

ہوئی۔ تمہارا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ اور گھوڑا بھی بیدم ہو گیا ہے۔ کیا تمہارے ساتھ کے لوگ بہت پیچھے رہ گئے"؟

راجکمار نے اس انداز بے پروائی سے کہا۔ گویا انہیں ان باتوں کا مطلق خیال نہیں ہے "یہی تو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں اور انہیں کچھ میری خبر بھی ہے۔ یا نہیں۔ لیکن آتے ہی ہوں گے میں ان کی راہ دیکھ رہا ہوں"۔

سنیاسی نے جواب دیا "تو یہاں دھوپ اور طوفان میں کھڑے کھڑے تم کب تک ان کا انتظار کرو گے۔ ہم جیسے فقیروں کو راجکماروں کے مہمان نوازی کی عزّت کہاں ملتی ہے۔ لیکن شاید میری خوش نصیبی تمہیں یہاں تک لائی ہے۔ ایشور تو تمہیں پرماتما نے بنایا ہے۔ مگر تھوڑی دیر تک فقیری کا مزہ لے لو۔ دیکھو کہ جنگلی پھولوں میں۔ اور دریا کے ٹھنڈے پانی میں اور پیال کے نرم بچھونے میں کتنا سکھ اور اطمینان ہے"۔

یہ کہہ کر سنیاسی نے اُس خاک اور خون میں لپٹے ہوئے ہرن کو ایسی آسانی سے اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ گویا وہ گھاس کا تودہ ہے۔ اور راجکمار سے بولا "یوں تو میں ایک کرارے نیچے اُتر جایا کرتا ہوں۔ مگر تمہارا گھوڑا شاید اتر نہ سکے۔ اس لئے

ایک دن کی راہ چھوڑ کر چھ مہینہ والی راہ چلیں گے۔ گھاٹ یہاں سے قریب ہے۔ وہیں میرا جھونپڑا ہے"+

راجکمار سنیاسی کے پیچھے پیچھے چلے۔ انہیں اُس کی جسمانی قوت پر حیرت ہو رہی تھی+ آدھ گھنٹہ تک دونوں خاموش چلتے رہے۔ آخر زمین نشیب کی طرف مائل ہونی شروع ہوئی۔ اور تھوڑی دیر میں گھاٹ آ پہنچا۔ وہیں کدم کے گھنے کنجوں کی چھاؤں میں۔ جہاں ہمیشہ غزالوں کی محفل آراستہ رہتی ہے اور لہروں کا نغمہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ جہاں سبزہ زار پر مور تھرکتا ہے۔ اور فاختہ اور کبوتر مست ہو ہو کر جھومتے ہیں سنیاسی کا مختصر سا جھونپڑا لتاؤں اور بیلوں سے لہراتا ہوا دکھائی دیا+

(۳)

سنیاسی کی کٹی ہرے ہرے درختوں کے آغوش میں سادگی اور قناعت کی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ راجکمار پر وہاں کی تازگی نے وہ جاں بخش اثر کیا جو مرجھائے ہوئے پودے پر پانی کی دھار کرتی ہے۔ اُنہیں آج تجربہ ہوا۔ کہ حلاوت اور سیری خوان لطیف کی پابند نہیں۔ اور نہ میٹھی نیند زرکار گاؤ تکئے کی محتاج ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوائیں آ رہی تھیں۔ آفتاب

اپنے آنشیں تخت پر بیٹھا ہوا شاید اس گوشۂ عافیت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اور سنہیاسی دھوپ اور چھاؤں کے فرش رقصاں پر بیٹھا ہوا مستانہ انداز سے گا رہا تھا:

اودھو کرمن کی گت نیاری

راجکمار کے کانوں میں نغمہ کی بھنک پڑی۔ اُٹھ بیٹھے۔ اور سننے لگے + انہوں نے اچھے اچھے کلاونتوں کی نغمہ سنجیوں کا لطف اُٹھایا تھا۔ انہیں خود اس فن میں لطف و ذوق تھا۔ اس نغمے نے ان پر خود فراموشی کا سرور پیدا کر دیا۔ آوازیں کوئل کی کوک کی سی نزاکت اور صفائی تھی۔ ایک ایک لفظ مضراب کی طرح جذبات کے جُدا جُدا تاروں پر پڑتا تھا۔ اور ان میں رعشہ پیدا کر دیتا تھا۔ ایک سماں چھایا ہوا تھا۔ دل آنند کے نشہ میں جھومتا تھا۔ اور خیال اُڑتا ہوا اُس دیس میں جا پہنچتا تھا۔ جہاں پریم بستا ہے۔ آرزوئیں کھلتی ہیں۔ اور بیخودی کی لہریں اٹھتی ہیں۔ جہاں کچھ ایسی چیزیں ہیں۔ جو یہاں نہیں ہیں۔ جو نظر آتی ہیں۔ مگر بیان نہیں کی جا سکتیں + رہ رہ کر لحن کا تغیر اور اُس کی بیساختگی اُنہیں تڑپا دیتی تھی +

سامنے دریا نے اپنا گلابی فرش بچھا رکھا تھا۔ اُس کے

دونوں طرف بالوں کے صندلی نخچے تھے۔ عالم خیال میں راجکمار کو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ معرفت کا دریا ہے۔ جس کی لہریں وجد میں آکر آہستہ آہستہ سر ہلا رہی ہیں۔ سطح آب پر تیرنے والی مرغابیاں اور بگلے اور پن ڈبیاں ایسی معلوم ہوتی تھیں۔ گویا وہ نورانی شبنمی روحیں ہیں۔ جو اس نغمہ کے نشہ میں سرشار ہیں!

جب گانا بند ہوا۔ تو راجکمار آکر سنیاسی کے سامنے بیٹھ گئے۔ اور عقیدت مندانہ جوش سے بولے "مہاتما جی! آپ کے منہ پر آپ کی بڑائی کرنا کچھ موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن آپ کے ویراگ اور پریم کا میرے دل پر جو اثر ہوا ہے۔ وہ بہت دنوں تک قائم رہے گا۔ اگر دنیا کی بیڑی پیروں میں نہ ہوتی تو آپ کے قدموں سے جدا ہونے کا نام نہ لیتا۔ مجھے آج معلوم ہو گیا۔ کہ آنند کا سرچشمہ کہاں ہے"۔

جوش روانی میں راجکمار کی زبان سے عقیدت اور انوراگ کی کتنی ہی باتیں نکل آئیں۔ جن سے اُن کی تقریر میں تکلف اور مبالغہ کا رنگ پیدا ہو گیا + سنیاسی مسکرایا۔ کیسی پامال گفتگو ہے۔ کیسے مانوس الفاظ۔ جن کی تہ میں مکر ہے۔ کوئی عارضی اثر ہو۔ لیکن کس قدر جلد مٹنے والا۔ بولے "تمہاری باتیں سُن کر

مجھے بہت خوشی ہوئی۔ جی نہیں چاہتا۔ کہ تمہیں جانے دوں۔ لیکن (مسکرا کر) اگر میں جانے دوں۔ تو بھی تم نہیں جا سکتے۔ سورج ڈوب رہا ہے۔ اب تم ریوان نہیں پہنچ سکتے۔ تمہیں شکار کا بہت شوق ہے! اور مجھے بھی اس کی دھن ہے۔ آج ہم دونوں اپنے اپنے کمال دکھائیں گے۔ خطرہ کا اندیشہ شاید تمہیں نہ روک سکتا۔ لیکن شکار کی امید تو ضرور ہی کامیاب ہو گی۔"

راجکمار کو بہت جلد معلوم ہو گیا۔ کہ ابھی ابھی ویراگ اور عقیدت کی جو باتیں انہوں نے کہیں تھیں۔ وہ دل سے نہیں۔ زبان سے نکلی تھیں۔ زندگی بھر سنیاسی کے قدموں سے لپٹے رہنے کے بجائے انہیں یہاں ایک رات بھر رہنا دشوار نظر آتا تھا۔ گھر پر لوگ گھبرائیں گے۔ معلوم نہیں کیا خیالات پیدا ہوں۔ ہمراہیوں کی جان عذاب میں ہو گی۔ چلو ایک رات یوں ہی سہی۔ گھوڑے میں دم نہیں رہا۔ اس پرچالیس میل کی منزل طے کرنے کے لئے بڑے صبر کی ضرورت ہے مگر یہ عجیب بات ہے۔ کہ یہ مہاتما بھی شکار کھیلتے ہیں۔ کیسا اجتماع ضدین ہے۔ غالباً ویدانتی ہیں۔ جو انسان کے ہاتھوں زندگی اور موت کے قائل نہیں ہوتے۔ ان کے ساتھ شکار

کھیلنے میں واقعی مزہ آئے گا۔

اس طرح سوچ بچار کر انہوں نے سنیاسی کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ اور اپنی خوش نصیبی کی تعریف کی۔ جس نے انہیں کچھ دیر اور اُن کی صحبت سے فیض اُٹھانے کا موقع دیا۔

(۴)

رات کے دس بجے خوب اندھیرا چھا گیا تھا۔ سنیاسی نے کہا۔ "اب ہمارے چلنے کا وقت آ گیا ہے۔ تیار ہو جائیے"۔

راجکمار پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے۔ بندوق کندھے پر رکھ کر بولے۔ "اس اندھیرے میں تو جنگلی سؤر خوب ملیں گے لیکن خوفناک جانور ہے"۔

سنیاسی نے ایک موٹا سا سونٹا ہاتھ میں لیا۔ اور بولے "شاید اس سے بھی اچھے شکار ہاتھ لگیں۔ میں اکیلے کبھی خالی نہیں لوٹتا۔ آج تو ہم دو ہیں"۔

دونوں شکاری دریا کے کنارے۔ تالوں اور ریت کے ٹیلوں کو پار کرتے۔ جھاڑیوں سے اُلجھتے چپ چاپ چلے جاتے تھے۔ ایک طرف نیلگوں ندی تھی۔ جس میں تارے

ناچتے تھے ۔ اور لہریں گاتی تھیں۔ دوسری طرف منجمد تاریکی تھی۔ بے حس اور بے حیات۔ صرف جگنو کبھی کبھی اپنی نورانی صورت دکھا کر غائب ہو جاتے تھے ۔ گویا وہ بھی اندھیرے میں نکلتے ڈرتے تھے ÷

اس طرح کوئی ایک گھنٹہ کی رفتار تیز کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچے ۔ جہاں ایک ٹیکرے پر گھنے درختوں کے بیچ میں آگ جلتی ہوئی دکھائی دی ÷ ثابت ہوا ۔ کہ دنیا میں تاریکی کے سوا اور بھی کچھ ہے ÷

سنیاسی نے ٹھہرنے کا اشارہ کیا ۔ اور دونوں ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر غور سے دیکھنے لگے + راجکمار نے بندوق بھر لی ۔ ٹیکرے کے اوپر برگد کا ایک چھتنار درخت تھا ۔ تاریکی کو اپنے سایہ حمایت میں لئے ہوئے ۔ اُسی درخت کے نیچے دس بارہ آدمی بیٹھے ہوئے چرس کے دم لگا رہے تھے ۔ سب کے سب مسلح تھے ۔ بندوق کندھوں پر رکھے ۔ چست مرزائیاں پہنے ۔ اونچے قد ۔ چوڑے سینے ۔ وجیہ اور مردانہ صورتیں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ کہ کسی فوجی دستہ کا جماؤ ہے ÷

راجکمار نے پوچھا ”کیا یہ لوگ بھی شکاری ہیں“ ÷

سنیاسی نے آہستہ سے کہا۔ ہاں یہ بڑے مشاق شکاری ہیں۔ یہ راہ چلتے مسافروں کا شکار کرتے ہیں۔ بڑے سرکش۔ جابر۔ خونخوار درندے ہیں۔ جن کے ظلم سے گاؤں کے گاؤں مٹ گئے۔ انہوں نے جتنے گھر تباہ کئے ہیں۔ اور جتنے خون بہائے ہیں۔ اُس کا حساب پرماتما ہی جانتا ہوگا۔ اگر آپ شکار کرنا چاہتے ہیں۔ تو ان کا شکار کیجئے۔ ایسے شکار آپ کو بہت تلاش سے بھی نہ مل سکیں گے۔ یہی درندے ہیں۔ جن پر آپ کے تیر و تبر کا نشانہ پڑنا چاہئے۔ یہی راجاؤں اور فرمانرواؤں کے شکار ہیں۔ اس میں آپ کا نام اور جس ہے"۔

(۵)

راجکمار کے جی میں تو آئی۔ کہ دو ایک ڈاکوؤں کو نشانہ مرگ بناؤں۔ مگر سنیاسی نے کہا۔ "انہیں چھیڑنا خطرے سے خالی نہیں۔ اگر اور کچھ نہ ہو تو بھی شکار بچ کر نکل جائے گا۔ چلو آگے چلیں ممکن ہے۔ اس سے بھی اچھے شکار ملیں"۔

اب سپتمی کا چاند نظر آیا۔ شکاریوں نے دریا کا کنارہ چھوڑ دیا تھا۔ بیہڑ بھی پیچھے رہ گیا تھا۔ سامنے ایک کچی سڑک دکھائی دی۔ کچھ آبادی کے نشان نظر آئے۔ یہ سنیاسی ایک عالی شان

محل کے قریب آکر رُکے۔ جس کے چاروں طرف پختہ چہار دیواری
تھی۔ اور راجکمار سے بولے آؤ۔ اس مولسری کے پیڑ پر بیٹھیں
مگر دیکھو خبردار منہ سے نہ بولنا۔ ورنہ ہم دونوں کی جان کے لالے
پڑ جائیں گے۔ یہاں ایک خوفناک درندہ آیا کرتا ہے۔ جس نے
بے شمار جانداروں کا خون کیا ہے۔ شاید آج آجائے۔ تو ہم
دونوں اس کا کام تمام کریں گے ❊

راجکمار دل میں بہت خوش ہوئے۔ کہ اب یہ رات بھر
کی دوڑ ٹھکانے لگے گی۔ دونوں مولسری کے پیڑ پر جا بیٹھے
راجکمار بندوق ہاتھ میں لے کر شکار کا انتظار کرنے لگے۔ جسے
وہ تیندوا سمجھتے تھے ❊

آدھی رات گذر چکی تھی۔ دفعتاً محل کے پاس کچھ ہلچل معلوم
ہوئی۔ اور دیوان خانہ کا دروازہ کھُل گیا۔ مومی شمعوں کی روشنی
احاطہ میں چاروں طرف پھیل گئی۔ کمرہ کے ہر ایک گوشہ میں
تکلّف اور نفاست اور عیش پرستی کے جلوے نظر آتے تھے۔
عین وسط میں ایک قوی ہیکل اور ذی رُعب آدمی گلے میں
ریشمی چادر ڈالے پیشانی پر زعفران کا ہلالی ٹیکہ لگائے مسند پر
بیٹھا ہوا۔ زرکار مُنہ نال سے دھوئیں نکال رہا تھا۔ تھوڑی

دیر میں عناصرِ نشاط جمع ہونے لگے۔ ماہرویوں کے دَل کے دَل ہنستے چہکتے آکر بیٹھ گئے۔ ان کی نازک اداؤں اور اُن کی نشہ خیز بیباکیوں کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ جو کسی تناور درخت کو بھی جڑ سے اکھاڑ سکتا تھا۔ اندر کا اکھاڑا سج گیا۔ سازندوں نے سُر ملایا۔ ترانہ دلفریب کی آوازیں بلند ہوئیں۔ شیشہ و ساغر کے دور چلنے لگے۔

راجکمار نے حیرت سے پوچھا۔ یہ تو کوئی بڑا رئیس معلوم ہوتا ہے؟

سنیاسی نے جواب دیا۔ یہ رئیس نہیں ہیں۔ یہ ایک بڑے مندر کے مہنت ہیں۔ سادھو ہیں۔ دنیا کو تیاگ چکے ہیں۔ دُنیا کی نعمتوں کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھاتے۔ پورے برہمچاری ہیں۔ ان کی باتوں میں معرفت کا دریا بہتا ہے۔ یہ سب اُن کی روحانی مسرّت کے سامان ہیں۔ نفس کو وہ مدت ہوئی قابو میں کر چکے ہیں۔ ہزاروں سیدھے سادے آدمی اُن پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ ان کو اپنا دیوتا سمجھتے ہیں۔ اگر آپ شکار کرنا چاہتے ہیں۔ تو ان کا شکار کیجئے۔ یہی راجاؤں اور فرماں رواؤں کے شکار ہیں۔ ایسے ہی رنگے ہوئے سیاروں کا تعاقب آپ کے

لئے مناسب ہے۔ یہی ریاکار ہیں۔ جن پر آپ کے تیر و تبر کا نشانہ پڑنا چاہیئے۔ اس میں آپ کی رعیت کی بھلائی۔ اور آپ کا جس ہے ۔

(۶)

دونوں شکاری نیچے اُترے۔ سنیاسی جی نے کہا۔ اب رات زیادہ آگئی ہے۔ تم بہت تھک گئے ہو گے۔ لیکن مجھے راجکمار ول کے ساتھ شکار کھیلنے کے موقع کہاں ملتے ہیں۔ میں ابھی ایک اَور شکار کا پتہ لگاؤں گا۔ اور تب یہاں سے لوٹیں گے ۔

راجکمار کو ان شکاروں میں سچے اُپدیش کا لطف آ رہا تھا۔ بولے۔ سوامی جی تھکنے کا نام نہ لیجیئے۔ کاش میں برسوں آپ کی خدمت میں رہتا۔ ایسے شکار کھیلنا سیکھتا۔

دونوں پھر آگے بڑھے۔ اب کے راستہ بہت صاف اور کشادہ تھا۔ شاید کچی سڑک تھی۔ دو رویہ درختوں کی قطار تھی۔ اور بعض بعض آم کے درخت کے نیچے رکھوالے لیٹے ہوئے تھے۔ گھنٹہ بھر کے بعد دونوں شکاری ایک بستی میں داخل ہوئے۔ جہاں کی سڑکیں لالٹین کی روشنی۔ اور بڑی بڑی عمارتیں بتاتی تھیں۔ کہ یہ کوئی بڑا قصبہ ہے۔ سنیاسی جی

ایک عالی شان محل کے سامنے ایک درخت کے نیچے ٹھہر گئے۔ اور راجکمار سے بولے۔ یہ سرکاری عدالت ہے۔ یہاں ریاست کا ایک بڑا منصبدار رہتا ہے۔ اسے صوبہ دار کہتے ہیں۔ صوبہ دار کی کچہری دن کو بھی لگتی ہے۔ اور رات کو بھی۔

یہاں انصاف۔ زروجواہر کی تول بکتا ہے۔ اُس کی قیمت حق نہیں ہے۔ بلکہ روپیہ ہے۔ اہل ثروت غریبوں کو پاؤں تلے کچلتے ہیں۔ اور کوئی ان کی فریاد نہیں سُنتا۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ یکایک بالاخانہ پر دو آدمی دکھائی دیئے۔ دونوں شکاری درخت کی آڑ میں چھپ گئے۔ سنیاسی جی نے کہا۔ شاید صوبہ دار صاحب کوئی معاملہ طے کر رہے ہیں۔

اوپر سے آواز آئی۔ تم نے ایک بیوہ عورت کی جائداد ہضم کر لی ہے۔ میں اسے خوب جانتا ہوں۔ یہ کوئی چھوٹا معاملہ نہیں ہے۔ اس معاملہ میں میں ایک ہزار سے نیچے بات نہیں کرنی چاہتا۔

راجکمار کو اور زیادہ سننے کی تاب نہ رہی۔ مارے غصہ کے لال ہو گئے۔ یہی جی چاہتا تھا۔ کہ اس موذی کو جل کر واصل جہنم کر دوں۔ لیکن سنیاسی جی نے روکا اور بولے۔ نہ۔ آج

اس شکار کا موقع نہیں ہے۔ اگر آپ ڈھونڈیں گے۔ تو ایسے شکار آپ کو زندگی میں بہت ملیں گے۔ میں نے اُن کے کچھ ٹھکانے بتا دیئے ہیں۔ اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ کٹی ابھی یہاں سے دس میل ہوگی۔ آیئے قدم بڑھائے ہوئے۔

(۷)

دونوں شکاری تین بجتے بجتے پھر کٹی میں آپہنچے۔ اس وقت بڑی سہانی رات تھی۔ نسیم سحر نے پیڑوں اور پتوں کو ہلا ہلا کر نیند سے جگانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن شب مہتاب کی پُر فریب روشنی تنویر صبح کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے تھی۔ راجکمار کو اس وقت ہری ہری دوب میں ماں کی گود کا آرام ملا۔ سو کر اٹھے تو دن خوب نکل آیا تھا۔ گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ سنیاسی جی نے کہا۔ ہاتھ منہ دھو لو۔ دھوپ ہو رہی ہے۔ تمہیں سخت تکلیف ہوگی۔ ریو یہاں سے بیس کوس سے کم نہیں ہے۔

آدھ گھنٹہ میں راجکمار تیار ہو گئے۔ اور سنیاسی سے اپنی عقیدت اور احسان مندی کا اظہار کرنے کے بعد اُن کے قدموں پر سر جھکا کر گھوڑے پر سوار ہو گئے۔

سنیاسی جی نے اُن کی پیٹھ پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ اور دعائیں دے کر بولے۔ راجکمار تم سے ملاقات کر کے میری طبیعت بہت خوش ہوئی۔ مجھے معلوم ہُوا۔ کہ تمہارے مزاج میں ابھی تک امیری درد اور دیا کو دبانے نہیں پائی۔ تمہیں پرماتما نے اپنی خلقت پر راج کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ تمہارا دھرم ہے۔ کہ عدل اور رحم سے اپنی پرجا کی پرورش کرو۔ تمہارے لئے بیکس۔ بیزبان جانوروں کا شکار کرنا موزون نہیں۔ یہ تمہاری شان کے خلاف ہے۔ ان غریب جانوروں کو مارنے میں کوئی دلیری۔ کوئی ساہس۔ کوئی مردانگی نہیں ہے۔ وہ انسان۔ جو مٹھی بھر پر رکھنے والی چڑیا کو نشانہ بندوق بنا کر۔ جامہ میں پھولا نہیں سماتا۔ اُس کے جسم میں گِدھ یا گیدڑ کی روح ہے۔ اس بھول میں ہرگز نہ پڑو۔ کہ شکار کا میدان جانبازی اور دلاوری اور ہمت کی درسگاہ ہے۔ جانبازی اور مردانگی کا سب سے بڑا مدرسہ بیکسوں کی دستگیری اور مظلوموں کی حمایت ہے یقین مانو کہ جو شخص محض تفریح طبع کے لئے جیووں کی ہنسیا کرتا ہے۔ جسے دوسروں کو ہلاک کرنے میں مزہ آتا ہے۔ وہ بے رحم جلّاد سے بھی زیادہ بے رحم اور سنگدل ہے۔ جلّاد

کے لئے یہ ذریعہ معاش ہے۔ شکاری کے لئے ذریعۂ تفریح۔ تمہارے لئے ایسے شکاروں کی ضرورت ہے۔ جن سے تمہاری رعیت کو آرام پہنچے۔ بیکس اور بے زبان جانوروں کے بجائے تمہیں اُن درندوں کے تعاقب میں دوڑنا چاہئیے۔ جو لسانی۔ دغا اور ابلہ فریبی کی آڑ میں دوسروں کو ہلاک کرتے ہیں۔ تمہارا نشانہ ہرن اور گیدڑ پر کیوں پڑے؟ اُسے اُس ریاکاری اور غارتگری اور ظلم پر پڑنا چاہئیے۔ جو نہایت بیدردی سے تمہاری پرجا کا خون چوس رہی ہے۔ تمہاری نگاہ تیز فاختہ اور موروں پر کیوں پڑے؟ اُس کے لئے ایمان فروشی۔ خیانت اور بے ایمانی کے گھونسلے کیا نہیں ہیں؟ ایسے شکار کھیلو جن سے تمہیں روحانی اطمینان حاصل ہو۔ اور تمہاری نیک نامی اور جس پھیلے۔ تمہارا کام ہلاک کرنا نہیں ہے۔ بلکہ زندہ رکھنا ہے اگر ہلاک کرو۔ تو صرف زندہ رکھنے کے لئے یہی تمہارا فرض ہے۔ جاؤ پرماتما کلیان کرے۔

کرموں کا پھل

کرموں کا پھل

(۱)

مجھے ہمیشہ آدمیوں کے پرکھنے کا خبط رہا ہے۔ اور تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ مطالعہ جس قدر دلچسپ۔ عبرت خیز اور انکشافات سے لبریز ہے۔ اتنا شاید اور کوئی مطالعہ نہ ہوگا لیکن اپنے دوست لالہ سائیں دیال سے بہت عرصہ تک دوستانہ اور بے تکلفانہ تعلقات رہنے پر بھی مجھے ان کی تھاہ نہ ملی۔ مجھے ایسے لاغر جسم میں عارفانہ صبر اور سکون دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ جو ایک نازک پودے کی طرح حوادث اور مصیبتوں کے جھونکوں میں بھی اچل اور اٹل رہتا تھا۔ یوں وہ بہت ہی معمولی درجہ کا آدمی تھا۔ جس میں انسانی کمزوریوں کی کمی نہ تھی۔ وہ وعدے بہت کرتا تھا۔ لیکن انہیں پورا

کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ وہ دروغگو نہ ہو۔ لیکن راستباز
بھی نہ تھا۔ بیمروت نہ ہو۔ لیکن اس کی مروت چھپی رہتی تھی۔
اُسے اپنے فرض پر پابند رکھنے کے لئے دباؤ اور نگرانی کی ضرورت
تھی۔ کفایت شعاری کے اصولوں سے بیخبر۔ محنت سے جی چرانے
والا۔ اصولوں کا کمزور۔ ایک ڈھیلا ڈھالا معمولی آدمی تھا۔
لیکن جب کوئی مصیبت سر پر آپڑتی۔ تو اُس کے دل میں
استقلال اور ہمت کی وہ زبردست طاقت پیدا ہو جاتی تھی۔
جسے شہادت کہہ سکتے ہیں۔ اس کے پاس نہ دولت تھی۔ نہ مذہبی
ارادت جو توکل اور تسلیم کا مخزن ہے۔ ایک مختصر سے کپڑے
کی دکان کے سوا کوئی معاشؔ نہ تھی۔ ایسی حالتوں میں اس
کی ہمت اور استحکام کا سونا کہاں چھپا ہوا تھا۔ یہاں تک
میری نگاہ تحقیق نہیں پہنچتی تھی +

(۲)

باپ کے مرتے ہی مصیبتوں نے اس پر یورش شروع کی۔
کچھ تھوڑا سا قرض ترکہ میں ملا۔ جس میں حیرت انگیز ارتقائی
طاقت پوشیدہ تھی۔ غریب نے ابھی برسی سے نجات نہیں
پائی تھی۔ کہ مہاجن نے نالش کی اور عدالت کے طلسمی احاطہ

میں پہنچتے ہی یہ مختصر ہستی یوں پھولی جس طرح مشک پھولتی ہے۔ ڈگری ہوئی جو کچھ جمع جتھا تھی۔ برتن بھانڈے ہانڈی تو اُس کے گہرے پیٹ میں سما گئے۔ مکان بھی نہ بچا۔ بچارے مصیبتوں کے مارے سائیں دیال کا اب کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ بالکل آوارہ وطن کوڑی کوڑی کو محتاج۔ کئی کئی دن فاقہ سے گزر جاتے۔ اپنی تو خیر چنداں فکر نہ تھی۔ لیکن بیوی تھی۔ دو تین بچے تھے۔ اُن کے لئے تو کوئی نہ کوئی فکر کرنی ہی پڑتی تھی۔ کنبہ کا ساتھ اور بے سروسامانی۔ بڑا دردناک نظارہ تھا۔ شہر سے باہر ایک درخت کی چھاؤں میں یہ شخص اپنے مصیبت کے دن کاٹ رہا تھا۔ سارے دن بازاروں کی خاک چھانتا آہ! میں نے ایک بار اسے ریلوے اسٹیشن پر دیکھا۔ اُس کے سر پر ایک بھاری بوجھ تھا۔ اُس کا نازک نازپروردہ جسم پسینہ میں شل تھا۔ پیر مشکل سے اٹھتے تھے۔ دم پھول رہا تھا۔ لیکن چہرے پر مردانہ استقلال اور مضبوط ارادے کا نور تھا۔ بشرہ سے کامل صبر جھلک رہا تھا۔ ایسا مطمئن تھا۔ گویا اُس کا آبائی پیشہ ہے۔ میں حیرت سے اُس کا منہ تکتا رہ گیا۔ ہمدردانہ رنج و ملال کے اظہار کی جرأت نہ

ہوئی۔ کئی مہینے تک یہی کیفیت رہی بالآخر اس کی ہمّت اور قوت برداشت اُسے اس دشوار گزار وادی سے باہر نکال لائی؎

(۳)

تھوڑے ہی دنوں کے بعد مصیبتوں نے اُس پر حملہ کیا۔ ایشور ایسا دن دشمن کو بھی نہ دکھلائے۔ میں ایک مہینہ کے لئے بمبئی چلا گیا تھا۔ وہاں سے لوٹ کر اس کی ملاقات کو گیا۔ آہ! وہ نظارہ یاد کرکے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور دل خوف و استکرار سے کانپ اُٹھتا ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ میں نے دروازہ پر آواز دی اور اپنے معمول کے مطابق بے تکلف اندر چلا گیا۔ مگر وہاں سائیں دیال کا وُہ ہنس مکھ چہرہ جس پر مردانہ ہمت کی فرحت بخش تازگی جھلکتی تھی۔ نظر نہ آیا۔ میں ایک ماہ کے بعد اس کے گھر جاؤں۔ اور وہ آنکھوں سے روتے۔ لیکن ہونٹوں سے ہنستے۔ دوڑ کر میرے گلے سے لپٹ نہ جائے! ضرور کوئی آفت ہے۔ اُس کی بیوی سر جھکائے آئی۔ اور مجھے اُس کے کمرہ میں لے گئی۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ سائیں دیال ایک چارپائی پر میلے کچیلے کپڑے لپیٹے آنکھیں بند کئے پڑا درد سے کراہ رہا تھا۔ جسم اور بچھونے

پر مکھیوں کے گچھے کے گچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آہٹ پاتے ہی اس نے میری طرف دیکھا۔ میرے جگر کے ٹکڑے ہو گئے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ نقاہت کی اس سے زیادہ سچی اور پُردرد تصویر نہیں ہو سکتی۔ اس کی بیوی نے میری طرف مایوسانہ نگاہوں سے دیکھا۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ اس سمٹے ہوئے ڈھانچے میں بیماری کو بھی مشکل سے جگہ ملتی ہوگی۔ زندگی کا کیا ذکر! آخر مَیں نے آہستہ سے پکارا۔ آواز سنتے ہی وہ بڑی بڑی آنکھیں کھل گئیں۔ لیکن اُن میں یاس اور غم کے آنسو نہ تھے۔ توکل اور رضا کی روشنی تھی۔ اور وہ زرد چہرہ! آہ۔ وہ صبر متین کی خاموش تصویر۔ وہ صابرانہ عزم کی زندہ یادگار۔ اس کی زردی میں مردانہ ہمت کی سرخی جھلکتی تھی۔ مَیں اُس کی صورت دیکھ کر گھبرا گیا۔ کیا یہ بُجھے ہوئے چراغ کی آخری جھلک تو نہیں ہے؟

میری سہمی ہوئی صورت دیکھ کر وہ مسکرایا۔ اور بہت ہی دھیمی آواز میں بولا۔ تم ایسے اُداس کیوں ہو۔ یہ سب میرے کرموں کا پھل ہے؟

(۴)

مگر کچھ عجب بدقسمت آدمی تھا۔ مصیبتوں کو اس سے کوئی خاص اُنس تھا۔ کسے امید تھی۔ کہ وہ اس جاں سوز مرض سے شفا پائے گا۔ ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا تھا۔ موت کے منہ سے نکل آیا۔ اگر مستقبل کا ذرا بھی علم ہوتا تو سب سے پہلے میں اُسے زہر دے دیتا۔ آہ! اس غمناک حادثہ کو یاد کر کے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ حیف ہے۔ اس زندگی پر کہ باپ اپنی آنکھوں سے اپنے اکلوتے بیٹے کا سوگ دیکھے!

کیسا ہنس مکھ۔ کیسا خوب صورت ہونہار لڑکا تھا۔ کیسا خلیق۔ کیسا شیریں زبان اچھا شعار۔ موت نے اسے چھانٹ لیا۔ پلیگ کی دُہائی مچی ہوئی تھی۔ شام کو گلٹی نکلی۔ اور صبح کو! کیسی منحوس نامبارک صبح تھی۔ وہ زندگی چراغِ سحری کی طرح بُجھ گئی۔ مَیں اس وقت اُس بچّے کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ اور سائیں دیال دیوار کا سہارا لئے ہوئے خاموش آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ میری اور اس کی آنکھوں کے سامنے ظالم اور بے رحم موت نے اس بچّے کو ہماری گود سے چھین لیا۔ میں روتے ہوئے سائیں دیال کے گلے سے لپٹ گیا۔ سارے

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ غریب ماں پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ بہنیں دوڑ دوڑ کر بھائی کی لاش سے لپٹتی تھیں۔ اور ذرا دیر کے لئے حسد نے بھی ہمدردی کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ محلہ کی عورتوں کو آنسو بہانے کے لئے دل پر زور ڈالنے کی ضرورت نہ تھی۔

جب میرے آنسو تھمے تو میں نے سائیں دیال کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں تو آنسو بھرے ہوئے تھے۔ آہ! صبر کا آنکھوں پر کوئی بس نہیں۔ لیکن چہرہ پر مردانہ تسلیم اور استقلال کا رنگ نمایاں تھا۔ اس غم و الم کے سیلاب اور طوفان میں بھی سکون کی کشتی اس کے دل کو ڈوبنے سے بچائے ہوئے تھی۔

اس نظارہ نے مجھے متحیر نہیں مبہوت کردیا۔ ممکنات کی حدیں کتنی ہی وسیع ہوں۔ ایسی جانکاہی کے عالم میں حواس اور اطمینان کو قائم رکھنا اُن حدود سے پرے ہے۔ لیکن اس لحاظ سے سائیں دیال انسان نہیں۔ فوق الانسان تھا۔ میں نے روتے ہوئے کہا۔ بھائی صاحب اب صبر کی آزمائش کا موقعہ ہے۔ اُس نے مستقل انداز سے جواب دیا۔ ہاں یہ کرموں کا

پھل ہے۔

میں ایک بار پھر بھوچک ہو کر اُس کا منہ تکنے لگا۔

(۵)

لیکن سائیں دیال کا یہ زاہدانہ توکل اور تحمل اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر بھی میرے دل میں شکوک باقی تھے۔ ممکن ہے جب تک صدمہ تازہ ہے۔ صبر کی باندھ قائم رہے۔ لیکن اس کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ اس میں شگاف ہو گئے ہیں۔ وہ اب زیادہ عرصہ تک غم و الم کی لہروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

کیا کوئی دنیاوی حادثہ اتنا جانکاہ۔ اتنا دلخراش۔ اتنا جگر سوز ہو سکتا ہے۔ صبر اور استقلال اور رضا و تحمل۔ یہ سب اس آندھی کے سامنے خاشاک سے زیادہ نہیں۔ مذہبی عقاید حتیٰ کہ معرفت بھی اس کے سامنے سر جھکا دیتی ہے۔ اس کے جھونکے یقین اور ایمان اور عقاید کی جڑیں ہلا دیتے ہیں۔

لیکن میرا گمان غلط نکلا۔ سائیں دیال نے دھیرج کو ہاتھ سے نہ دیا۔ وہ حسب دستور زندگی کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ دوستوں کی ملاقاتیں اور کتھا۔ دریا کی سیر اور تفریح اور میلوں کی چہل پہل۔ ان دلچسپیوں میں اُس کے دل کو کھینچنے کی طاقت

اب بھی باقی تھی۔ میں اُس کی ایک ایک حرکت کو ایک ایک بات کو غور سے مطالعہ کرتا۔ مَیں نے دوستی کے آداب و آئین کو فراموش کر کے اسے اس عالم میں دیکھا۔ جہاں اس کے خیالات کے سوا اَور کوئی غیر نہ تھا۔ لیکن اس عالم میں بھی اس کے چہرہ پر اُسی مردانہ تحمل کا جلوہ تھا۔ اور شکوہ شکایت کا ایک نقطہ بھی اس کی زبان پر نہیں آیا۔

(۶)

اسی اثناء میں میری چھوٹی لڑکی چندر مکھی نمونیا کی نذر ہو گئی دن کے دھندے سے فرصت پا کر جب میں گھر پر آتا۔ اور اُسے پیار سے گود میں اُٹھا لیتا۔ تو میرے دل کو جو تفریح اور روحانی تقویت ہوتی تھی۔ اُسے لفظوں میں نہیں ادا کر سکتا۔ اس کی ادائیں صرف دلربا نہیں۔ غم ربا تھیں۔ جس وقت وہ ہمک کر میری گود میں آتی۔ تو مجھے کونین کی دولت مل جاتی تھی۔ اس کی شرارتیں کتنی دلاویز تھیں۔ اب حقہ میں لطف نہیں رہا۔ کوئی چلم کو گرانے والا نہیں۔ کھانے میں مزہ نہیں آتا۔ کوئی تھالی کے پاس بیٹھا ہُوا اس پر تصرف بیجا نہیں کرتا۔ میں اُس کی لاش کو گود میں لئے بلک بلک کر رو رہا تھا۔ یہی جی چاہتا تھا کہ

اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ یکایک میں نے سائیں وہاں کو آتے دیکھا۔ میں نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ اور اس ننھی سی جان کو زمین پر لٹا کر باہر نکل آیا۔ اس صبر و تحمل کے دیوتا نے میری طرف ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور میرے گلے سے لپٹ کر رونے لگا۔ میں نے کبھی اُسے اس طرح چیخیں مار کر روتے نہیں دیکھا تھا روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اضطراب سے سب لے سدھ اور بیحال ہو گیا۔ یہ وہی شخص ہے۔ جس کا اکلوتا بیٹا مرا اور پیشانی پر بل نہیں آیا۔ یہ کایا پلٹ کیوں ہے

(۷)

اس سانحہ کے کئی دن بعد جبکہ غم رسیدہ دل سنبھلنے لگا تھا۔ ایک روز ہم دونوں دریا کی سیر کو گئے۔ شام کا وقت تھا۔ دریا کہیں سنہرا کہیں نیلگوں۔ کہیں سیاہ۔ کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ ہم دور جا کر ایک ٹیلہ پر بیٹھ گئے۔ لیکن طبیعت گفتگو کی طرف مائل نہ تھی۔ دریا کی خاموش روانی نے ہم کو بھی محو خیال کر دیا۔ دریا کی موجیں خیال کی لہروں کو پیدا کر دیتی ہیں مجھے ایسا معلوم ہُوا۔ کہ پیاری چندر مکھی لہروں کی گود میں بیٹھی مسکرا رہی ہے۔ میں چونک پڑا۔ اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے

کے لئے دریا میں منہ دھونے لگا۔ سائیں دیال نے کہا۔ بھائی صاحب! دل کو مضبوط کرو۔ اس طرح کڑھو گے۔ تو ضرور بیمار ہو جاؤ گے۔ میں نے جواب دیا۔ ایشور نے جتنا ضبط تمہیں دیا ہے اس میں سے تھوڑا سا مجھے بھی دے دو۔ میرے دل میں اتنی طاقت کہاں! سائیں دیال مسکرا کر میری طرف تاکنے لگا۔

میں نے اسی سلسلہ میں کہا۔ کتابوں میں تو استقلال اور صبر کی بہت سی روایتیں پڑھی ہیں۔ مگر یقین مانو۔ کہ تم جیسا مستقل مزاج۔ مشکلات میں سیدھا کھڑا رہنے والا انسان آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ تم جانتے ہو۔ کہ مجھے انسانی خاصا کے مطالعہ کا ہمیشہ سے شوق ہے۔ لیکن میرے تجربہ میں تم اپنی قسم کے اکیلے آدمی ہو۔ میں یہ مانوں گا۔ کہ تمہارے دل میں درد و گداز نہیں ہے۔ اسے میں اپنی آنکھوں دیکھ چکا ہوں۔ پھر اس عارفانہ صبر و اطمینان کا راز تم نے کہاں چھپا رکھا ہے۔ تمہیں اس وقت یہ راز مجھ سے کہنا پڑے گا۔

سائیں دیال کچھ شش و پنج میں پڑ گیا۔ اور زمین کی طرف تاکتے ہوئے بولا۔ یہ کوئی راز نہیں۔ میرے کرموں کا پھل ہے یہ جملہ میں نے چوتھی بار اس کی زبان سے سنا۔ اور بولا جن

کرموں کا پھل ایسا تقویت بخش ہے۔ اُن کرموں کی کچھ مجھے بھی تلقین کرو۔ میں ایسے پھلوں سے کیوں محروم رہوں"۔

سائیں دیال نے پُرحسرت لہجہ میں کہا" ایشور نہ کرے۔ کہ تم سے ایسے کرم سرزد ہوں۔ اور تمہاری زندگی پر اُن کا سیاہ داغ لگے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ مجھے اپنی نگاہ میں ایسا شرمناک اور ایسا قبیح معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس کی مجھے جو کچھ سزا ملے میں اُسے خوشی کے ساتھ جھیلنے کو تیار رہوں۔ آہ! میں نے ایک ایسے پاکیزہ خاندان کو جہاں میرا اعتبار اور وقار تھا۔ اپنی نفس کی غلاظت سے ملوّث کیا ہے۔ ایک ایسے پاک دل کو جس میں محبت کا درد تھا۔ جو باغ حُسن کی ایک نوشگفتہ کلی تھی۔ جس میں سادگی اور وفا تھی۔ اُس پاک دل میں میں نے گناہ اور دغا کا بیج ہمیشہ کے لئے بو دیا۔ یہ گناہ ہے جو مجھ سے سرزد ہوا ہے۔ اور اس کا پلّہ اُن مصیبتوں سے بہت بھاری ہے۔ جو میرے اوپر اب تک پڑی ہیں۔ یا آئندہ پڑیں گی۔ کوئی سزا کوئی صدمہ۔ کوئی نقصان اُس کا کفارہ نہیں ہو سکتا"۔

مجھے خواب میں بھی یہ گمان نہیں تھا۔ کہ سائیں دیال اپنے عقاید کا اتنا مضبوط ہے۔ گناہ ہر شخص سے ہوتے ہیں۔

ہماری انسانی ہستیاں گناہوں کی طولانی فہرستیں ہیں۔ وہ کون سا دامن ہے۔ جس پر یہ سیاہ داغ نہ ہوں۔ لیکن کتنے ایسے آدمی ہیں۔ جو اپنے اعمال کی سزاؤں کو ایسی خندہ پیشانی سے جھیلنے کے لئے تیار رہوں۔ ہم آگ میں کودتے ہیں۔ لیکن جلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

میں سائیں دیال کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ ان باتوں کو سُن کر میری نظروں میں اس کی عزت سہ چند ہو گئی۔ ایک معمولی دنیادار انسان کے سینہ میں ایک فقیر کا دل چھپا ہوا تھا۔ جس میں معرفت کا نور چمکتا تھا۔ مَیں نے اُس کی طرف ارادتمند آنکھوں سے دیکھا۔ اور اُس کے گلے سے لپٹ کر بولا:۔

"سائیں دیال۔ اب تک میں تمہیں ایک مستقل مزاج آدمی سمجھتا تھا۔ لیکن آج معلوم ہوا۔ کہ تم اُن پاک نفسوں میں ہو جن کا وجود دنیا کے لئے برکت ہے۔ تم ایشور کے سچے بھگت ہو۔ اور میں تمہارے قدموں پر سر جھکاتا ہوں"۔

مناون

(۱)
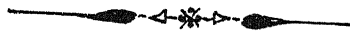
بابو دیال شنکر ان لوگوں میں تھے۔ جنہیں اس وقت تک لطف صحبت نہیں حاصل ہوتا۔ جب تک کہ وہ معشوق کی تیزی زبان کا مزہ نہ اُٹھائیں۔ روٹھے ہوئے کو منانے میں انہیں بڑا حظ ہوتا پھری ہوئی نگاہیں کبھی کبھی نشہ محبت کی متوالی آنکھوں سے بھی زیادہ دلربا معلوم ہوتیں۔ کبھی کبھی معشوقانہ بے اعتنائیاں اور ترشیاں گرمجوشیوں سے بھی زیادہ دلفریب محسوس ہوتیں۔ شکر رنجیوں میں شکر ریزیوں سے زیادہ سرور حاصل ہوتا۔ پانی میں ہلکے ہلکے جھکولے کیسا سماں دکھا جاتے ہیں۔ جب تک دریا میں دھیرا دھیرا تلاطم نہ ہو۔ لطف سیر نہیں۔

اگر بابو دیا شنکر کو ان دلچسپیوں کے کم موقعے ملتے تھے۔ تو

یہ اُن کا قصور نہ تھا۔ گرجا طبعاً بہت نیک اور متین واقع ہوئی تھی۔ تاہم چونکہ اسے اپنے شوہر کے رنگ مذاق کا تجربہ ہو چکا تھا اس لئے وہ کبھی کبھی اپنی طبیعت کے خلاف محض اُن کی خاطر سے۔ اُن سے روٹھ جاتی تھی۔ مگر یہ بے نیو کی دیوار ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ سنبھال سکتی۔ اُس کی آنکھیں۔ اس کے ہونٹ۔ اور اس کا دل۔ یہ بہروپ زیادہ دیر تک نہ رکھ سکتے۔ آسمان پر گھٹائیں آتیں۔ مگر ساون کی نہیں۔ کنوار کی۔ وہ ڈرتی۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہنسی میں رونا آجائے۔ آپس کی بدمزگی کے خیال سے اس کی روح فنا ہو جاتی تھی۔ مگر ان موقعوں پر بابو صاحب کو جیسی جیسی رجھانے والی گھاتیں سوجھتیں۔ وہ کاش طالب علمی کے زمانہ میں سوجھی ہوتیں۔ تو وہ کئی سال تک قانون سے سر مارنے کے بعد بھی معمولی کلرک نہ رہتے ۔

(۲)

دیا شنکر کو قومی کانفرنسوں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کی بنیاد اُسی زمانہ میں پڑی۔ جب وہ درگاہ قانون کے مجاور تھے۔ اور وہ اب تک قائم تھی۔ روپیوں کی تھیلی غائب ہو گئی تھی۔ مگر کندھوں میں درد موجود تھا۔ اس سال کا نفرنس کا

جلسہ ستارہ میں ہونے والا تھا۔ مقررہ تاریخ سے ایک روز قبل بابو صاحب ستارہ کو روانہ ہوئے۔ سفر کی تیاریوں میں اس قدر منہمک تھے۔ کہ گرجا سے بات چیت کرنے کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ آنے والی خوشیوں کی اُمید اس چند روزہ جُدائی کے خیال پر غالب تھی۔

کیسا شہر ہوگا! بڑی تعریف سنتے ہیں۔ دکن حُسن اور دولت کی کان ہے۔ خوب سیر رہے گی۔ حضرت تو ان دل خوش کن خیالوں میں سرمست تھے۔ اور گرجا آنکھوں میں آنسو بھرے اپنے دروازہ پر کھڑی یہ کیفیت دیکھ رہی تھی۔ اور ایشور سے منتیں کر رہی تھی۔ کہ انہیں خیریت سے لانا۔ وہ خود ایک ہفتہ کیونکر کاٹے گی۔ یہ خیال بہت جگردوز تھا۔

گرجا ان خیالات میں محو تھی۔ اور دیاشنکر سامان سفر میں یہاں تک کہ سب تیاریاں پوری ہوگئیں۔ یکہ دروازہ پر آگیا۔ بستر اور ٹرنک اس پر رکھ دیئے گئے۔ اور تب الوداعی ملاقات کی باتیں ہونے لگیں۔ دیاشنکر گرجا کے سامنے آئے اور مسکرا کر بولے "اب جاتا ہوں"۔

گرجا کے کلیجے میں ایک برچھی سی لگی۔ بے اختیار جی چاہا۔

کہ اُن کے سینہ سے لپٹ کر رؤں۔ آنسوؤں کا ایک سیلاب سا آنکھوں میں آتا ہُوا معلوم ہوا۔ مگر ضبط کر کے بولی۔ جانے کو کیسے کہوں۔ کیا وقت آ گیا؟

دیا شنکر۔ ہاں۔ بلکہ دیر ہو رہی ہے*

گرجا۔ منگل کو شام کی گاڑی سے آؤ گے نا؟

دیا شنکر۔ ضرور کسی طرح نہیں رُک سکتا۔ تم صرف اُسی دن میرا انتظار کرنا*

گرجا۔ ایسا نہ ہو بھول جاؤ۔ ستارہ بہت اچھا شہر ہے*

دیا شنکر۔ (ہنس کر) وہ بہشت ہی کیوں نہ ہو منگل کو یہاں ضرور آجاؤں گا۔ دل برابر یہیں رہے گا۔ تم ذرا بھی نہ گھبرانا*

یہ کہہ کر گرجا کو گلے لگا لیا۔ اور مُسکراتے ہوئے باہر نکل آئے یکہ روانہ ہو گیا۔ گرجا پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اور خوب روئی۔ مگر اس غم فرقت۔ سیلاب اشک۔ درد تنہائی۔ اور ہجوم جذبات کے ساتھ ایک اَور خیال دل میں جا گزیں تھا۔ جسے وہ بار بار ہٹانے کی کوشش کرتی تھی "کیا ان کے پہلو میں دل نہیں ہے یا ہے تو اُس پر اُنہیں پوری قدرت حاصل ہے؟ وہ مسکراہٹ جو رخصت ہوتے وقت دیا شنکر کے چہرہ پر جھلک رہی تھی

گرجا کی سمجھ میں نہیں آتی تھی*

(۳)

سنارہ میں بڑی دھوم دھام تھی۔ دیاشنکر گاڑی سے اُترے تو وردی پوش والنٹیروں نے اُن کا استقبال کیا۔ ایک فٹن اُن کے لئے تیار کھڑی تھی۔ اُس پر بیٹھ کر وہ کانفرنس پنڈال کی طرف چلے۔ دورویہ بیرقیں لہرا رہی تھیں۔ دروازہ پر بندھن وار ہیں لٹک رہی تھیں۔ عورتیں اپنے جھروکوں سے۔ اور مرد برآمدوں میں کھڑے ہو ہو کر مسرت کی تالیاں بجاتے تھے۔ اس شان و شکوہ کے ساتھ وہ پنڈال میں پہنچے۔ اور ایک خوب صورت خیمہ میں فروکش ہوئے۔ یہاں آسائش کے سب سامان مہیا تھے۔ دس بجے کانفرنس شروع ہوئی۔ مقررین اپنی اپنی زبانی لطافت کے جلوے دکھانے لگے۔ کسی کے ظرافت آمیز چٹکلوں پر واہ واہ کی دھوم مچ گئی۔ کسی کی شعلہ بار فصاحت نے دلوں میں جوش کی ایک لہر سی پیدا کر دی۔ عالمانہ رنگ کی تقریروں کے مقابلہ میں ظرافت اور تمسخر۔ اور حسن بیان کی زیادہ داد ملی۔ ناظرین کو ان تقریروں میں تھیٹر کے نغموں کا سا لطف آتا تھا*

کئی دن تک یہی کیفیت رہی - اور تقریروں کے اعتبار سے
کانفرنس کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی - آخرکار منگل کا دن آیا -
بابو صاحب واپسی کی تیاریاں کرنے لگے - مگر کچھ ایسا اتفاق ہوا
کہ آج انہیں مجبوراً ٹھہرنا پڑا - صوبہ بمبئی اور صوبہ متحدہ کے
ڈیلیگٹوں میں ایک ہاکی میچ کی ٹھہر گئی - بابو دیاشنکر ہاکی کے
بہت اچھے کھلاڑی تھے - وہ بھی ٹیم میں داخل کر لئے گئے انہوں
نے بہت کوشش کی - کہ اپنا گلا چھڑا لوں - مگر احباب نے اُن
کی عذر معذرت پر بالکل توجہ نہ کی - ایک صاحب جو زیادہ بے
تکلف تھے - بولے "آخر تمہیں اس قدر عجلت کیوں ہے؟ تمہارا
دفتر ابھی ہفتہ بھر بند ہے - بیوی صاحبہ کی خفگی کے سوا مجھے
اس عجلت کا کوئی سبب نظر نہیں آتا" دیاشنکر نے جب دیکھا -
کہ عنقریب مجھ پر زن مرید کی پھبتیاں چست کی جانے والی ہیں
جس سے زیادہ ہتک آمیز مرد کی شان میں کوئی دوسرا کلمہ نہیں
کہا جا سکتا - تو انہوں نے سفر کی کوئی صورت نہ دیکھ کر واپسی
ملتوی کر دی - اور ہاکی میں شریک ہو گئے - مگر دل میں
یہ مصمم ارادہ کر لیا - کہ شام کی گاڑی سے ضرور چلے جائیں گے
پھر چاہے کوئی زن مرید کہے یا پاپ کہے - ایک نہ

مانیں گے۔

خیر پانچ بجے کھیل شروع ہوا۔ دونوں طرف کے کھلاڑی مشاق اور چابک دست تھے۔ جنہوں نے ہاکی کھیلنے کے سوا زندگی میں اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔ کھیل بڑے جوش اور سرگرمی سے ہونے لگا۔ کئی ہزار تماشائی جمع تھے۔ ان کی تالیاں اور بڑھاوے کھلاڑیوں پر رجز کا کام کر رہے تھے۔ اور گیند کسی نامراد کی قسمت کی طرح اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ دیاشنکر کے ہاتھوں کی تیزی اور صفائی۔ اُن کی گرفت۔ اور بے عیب نشانہ بازی پر لوگ عش عش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب وقت ختم ہونے میں صرف ایک منٹ باقی رہ گیا تھا۔ اور طرفین کے لوگ ہمتیں ہار چکے تھے۔ تو دیاشنکر نے گیند لیا۔ اور بجلی کی طرح فریق مخالف کے گول پر پہنچ گئے۔ ایک پٹاخے کی آواز آئی۔ چاروں طرف سے "گول" کا نعرہ بلند ہوا۔ الہ آباد کی جیت ہوئی۔ اور اس فتح کا سہرا دیاشنکر کے سر تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ غریب دیاشنکر کو اس وقت بھی رُکنا پڑا۔ اور محض اتنا ہی نہیں۔ ستارہ امیچیسر کلب کی طرف سے اس فتح کی مبارکباد میں ایک ناٹک کھیلنے کی تجویز ہوئی۔ جس سے بدھ کے روز بھی روانہ ہونے کی

کوئی اُمید باقی نہ رہی۔ دیاشنکر نے دل میں بہت پیچ و تاب کھایا۔ مگر زبان سے کیا کہتے۔ زن مرید کہلانے کا خوف زبان بند کئے ہوئے تھا۔ حالانکہ ان کا دل کہہ رہا تھا۔ کہ اب کی دیوی روٹھیں گی۔ تو محض خوشامدوں سے نہ مانیں گی ؎

(۴)

بابو دیاشنکر روز وعدہ کے تین دن بعد مکان پر پہنچے۔ بنارس سے گرجا کے لئے کئی نادر تحفے لائے تھے۔ مگر اس نے ان چیزوں کو کچھ اس طرح دیکھا۔ گویا ان سے اُس کا جی سیر ہو گیا ہے۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اور ہونٹ خشک تھے۔ دو دن سے اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اگر چلتے وقت دیاشنکر کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے ٹپک پڑے ہوتے۔ یا کم از کم چہرہ کچھ اُداس اور آواز کچھ بھاری ہو گئی ہوتی۔ تو غالباً گرجا اُن سے نہ روٹھتی۔ آنسوؤں کی چند بوندیں اُس کے دل میں اس خیال کو تر و تازہ رکھتیں۔ کہ اُن کے نہ آنے کا سبب چاہے اور کچھ ہو۔ بے اعتنائی ہرگز نہیں ہے۔ غالباً دریافت حال کے لئے اس نے تار دیا ہوتا۔ اور اپنے شوہر کو اپنے سامنے بخیریت دیکھ کر وہ بے اختیار اُن کے سینہ سے جا چمٹتی۔ اور دیوتاؤں کی ممنون

ہوتی۔ مگر آنکھوں کا وہ بے موقع تحمل اور چہرہ کی وہ ظالمانہ شگفتگی اس وقت اس کے گوشۂ جگر میں کھٹک رہی تھی۔ دل میں یہ خیال جم گیا تھا۔ کہ میں چاہے ان کے لئے مر بھی مٹوں۔ مگر انہیں میری پروا نہیں ہے۔ دوستوں کا اصرار اور ضد محض حیلہ ہے کوئی زبردستی کسی کو روک نہیں سکتا۔ خوب! میں تو رات کی رات بیٹھ کر کاٹوں۔ اور وہاں مزے اڑائے جائیں ۔

بابو دیا شنکر کو روٹھوں کے منانے کا خاص ملکہ تھا۔ اور اس موقع پر انہوں نے کوئی فکر۔ کوئی کوشش۔ اٹھا نہیں رکھی۔ تحفے تو لائے تھے۔ مگر ان کا جادو نہ چلا۔ تب ہاتھ جوڑ کے ایک پیر سے کھڑے ہو گئے۔ گدگدایا تلوے سہلائے کچھ شوخی اور شرارت کی۔ دس بجے تک انہیں مساعی جمیلہ میں مصروف رہے۔ اس کے بعد کھانے کا وقت آیا۔ آج انہوں نے روکھی روٹیاں بڑے شوق سے اور معمولی مقدار سے دو چند کھائیں۔ گرجن! آج ہفتہ بھر کے بعد روٹیاں نصیب ہوئی ہیں۔ ستارہ میں روٹیوں کو ترس گئے۔ پوریاں کھاتے کھاتے آنتوں میں باؤگولے پڑ گئے۔ یقین مانو گرجن! وہاں کوئی آرام نہ تھا نہ کوئی سیر۔ نہ کوئی لطف۔ سیر اور لطف تو محض اپنے دل کی

کیفیت پر منحصر ہے۔ بے فکری ہو تو چٹیل میدان میں باغ کا لُطف آتا ہے۔ اور طبیعت کو کوئی فکر ہو تو باغ ویرانے سے بھی زیادہ اُجاڑ معلوم ہوتا ہے۔ کم بخت دل تو ہر دم یہیں دھرا رہتا تھا۔ وہاں لطف کیا خاک آتا۔ تم چاہے ان باتوں کو محض بناوٹ سمجھ لو۔ کیونکہ مَیں تمہارے سامنے خطاوار ہوں۔ اور تمہیں اختیار ہے۔ کہ مجھے جھوٹا۔ مکّار۔ دغاباز۔ بیوفا۔ زمانہ ساز۔ جو مناسب سمجھو۔ خیال کرو۔ مگر حقیقت یہی ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں میری وعدہ فراموشی کا سبب دوستوں کی ضد تھی ؛

دیاشنکر نے روٹیوں کی خوب داد دی۔ کیونکہ پہلے کئی بار یہ ترکیب مفید ثابت ہوئی تھی۔ مگر آج یہ منتر بھی کارگر نہ ہُوا۔ اور گرجا کے تیور بدلے ہی رہے ؛

سہ پہر کے وقت دیاشنکر گرجا کے کمرہ میں گئے۔ اور پنکھا جھلنے لگے۔ یہاں تک کہ گرجا جھنجھلا کر بول اُٹھی۔ اپنی نازبرداریاں اپنے ہی پاس رکھئے۔ میں نے حضور سے بھرپایا۔ میں تمہیں پہچان گئی۔ اب دھوکا نہیں کھانے کی۔ مجھے نہ معلوم کہ مجھ سے آپ یوں دغا کریں گے۔ غرض جن الفاظ میں بیوفائیوں۔ اور بے نیازیوں کی شکایتیں ہُوا کرتی ہیں۔ وہ سب اس وقت

گرجا نے صرف کر ڈالے ۔

(۵)

شام ہوئی۔ شہر کی گلیوں میں موتئیے اور بیلے کی لپٹیں آنے لگیں۔ سڑکوں پر چھڑکاؤ ہونے لگا۔ اور مٹی کی سوندھی خوشبو اڑنے لگی۔ گرجا کھانا پکانے جا رہی تھی۔ کہ اتنے میں اس کے دروازہ پر ایک یکہ آکر رکا۔ اور اس میں سے ایک نازنین اتر پڑی۔ اُس کے ساتھ ایک مہری تھی۔ اس نے اوپر آکر گرجا سے کہا۔ "بہوجی آپ کی سکھی آ رہی ہیں"۔

یہ سکھی پڑوس میں رہنے والی اہلمد صاحب کی بیوی تھیں۔ اہلمد صاحب بوڑھے آدمی تھے۔ اُن کی پہلی شادی اس وقت ہوئی تھی۔ جب دودھ کے دانت نہ ٹوٹے تھے۔ دوسری شادی حسنِ اتفاق سے اُس زمانہ میں ہوئی جب منہ میں ایک دانت بھی باقی نہ تھا۔ لوگوں نے بہت سمجھایا۔ کہ اب آپ بوڑھے ہوئے شادی نہ کیجئے۔ ایشور نے لڑکے دیئے ہیں۔ بہوئیں ہیں۔ آپ کو کسی بات کی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ مگر اہلمد صاحب خود بزرگ اور جہاں دیدہ آدمی تھے۔ ان بہی خواہانہ مشوروں کا جواب عملی مثالوں سے دیا کرتے تھے۔ کیوں کیا موت کو بوڑھوں سے کوئی دشمنی ہے؟ بوڑھے

غریب اس کا کیا بگاڑتے ہیں۔ ہم باغ میں جاتے ہیں۔ تو مرجھائے ہوئے پھول نہیں توڑتے۔ ہماری نگاہیں تر و تازہ۔ شاداب۔ خوب صورت پھولوں پر پڑتی ہیں۔ کبھی کبھی گجرے وغیرہ بنانے کے لئے کلیاں بھی توڑلی جاتی ہیں۔ یہی کیفیت موت کی ہے۔ کیا جمراج کو اتنی سمجھ بھی نہیں ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جوان اور بچے بوڑھوں سے زیادہ مرتے ہیں۔ میں ابھی جوں کا توں ہوں میرے تین جوان بھائی۔ پانچ بہنیں۔ بہنوں کے شوہر۔ تینوں بھاوجیں۔ چار بیٹے۔ پانچ بیٹیاں۔ کئی بھتیجے سب میری آنکھوں کے سامنے اس دنیا سے چل بسے۔ موت سب کو نگل گئی۔ مگر میرا بال بیکا نہ کر سکی۔ یہ غلط۔ بالکل غلط ہے۔ کہ بوڑھے آدمی جلد مر جاتے ہیں۔ اور اصل بات تو یہ ہے۔ کہ جوان بیوی کی ضرورت بڑھاپے ہی میں ہوتی ہے۔ بہوئیں میرے سامنے نکالا نہ چاہیں۔ اور نہ نکل سکتی ہیں۔ بھاوجیں خود بوڑھی ہوئیں چھوٹے بھائی کی بیوی میری پرچھائیں بھی نہیں دیکھ سکتی ہیں بہنیں اپنے اپنے گھر ہیں۔ لڑکے سیدھے منہ سے بات نہیں کرتے میں ٹھہرا بوڑھا۔ بیمار پڑوں تو پاس کون پھٹکے؟ ایک لوٹا پانی کون دے؟ دیکھوں کس کی آنکھ سے ؟ جی کیسے بہلاؤں۔ کیا خودکشی

کروں - یا کہیں ڈوب مروں؟ ان دلیلوں کے مقابلہ میں کسی کی زبان نہ کھلتی تھی ۔

غرض اس نئی اہلمدن - اور گرجا میں کچھ بہنا پاسا ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی اس سے ملنے آجایا کرتی تھی - اپنی قسمت پر شاکر عورت تھی - کبھی شکایت یا رنج کا ایک کلمہ زبان سے نہ نکالتی - ایک بار گرجا نے مذاق کہا تھا - کہ بوڑھے اور جوان کا میل اچھا نہیں ہوتا - اس پر وہ ناراض ہو گئی - اور کئی دن تک نہ آئی - گرجا مہمان کو دیکھتے ہی فوراً آنگن میں نکل آئی - اور گو اس وقت مہمان کا آنا ناگوار گزرا - مگر مسری سے بولی "بہن اچھی آئیں - دو گھڑی دل بہلے گا" ۔

تھوڑی دیر میں اہلمدن صاحب گہنے سے لدی ہوئی گھونگٹ نکالے چھم چھم کرتی ہوئی آنگن میں آکر کھڑی ہو گئیں - گرجا نے قریب آکر کہا "واہ سکھی - آج تو تم دُلھن بنی ہوئی ہو - مجھ سے پردہ کرنے لگیں کیا" یہ کہہ کر اس نے گھونگھٹ ہٹا دیا - اور سکھی کا منہ دیکھتے ہی چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی - دیا شنکر نے زور سے قہقہہ لگایا گرجا کو بستہ سے لپٹا لیا - اور منت آمیز لہجہ میں بولے "گرجن! اب مان جاؤ - ایسی خطا پھر کبھی نہ ہو گی" - مگر گرجن الگ ہٹ گئی - اور

دکھائی سے بولی " تمہارا بہروپ بہت دیکھ چکی۔ اب تمہارا اصلی روپ دیکھنا چاہتی ہوں" ÷

(۶)

دیا شنکر دریائے الفت کے ہلکے ہلکے تلاطم کا لطف تو ضرور اٹھانا چاہتے تھے۔ مگر طوفان سے ان کی طبیعت بھی اسی قدر گھبراتی تھی۔ جس قدر گرجا کی۔ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔ تالیف قلب کے جتنے منتر انہیں یاد تھے۔ وہ سب اُنہوں نے پڑھے۔ اور اُنہیں کارگر نہ ہوتے دیکھ کر آخر ان کی طبیعت کو بھی اُلجھن ہونے لگی۔ یہ وہ مانتے تھے۔ کہ بے شک مجھ سے خطا ہوئی ہے۔ مگر خطا ان کے خیال میں ایسی جانسوز سزاؤں کی مستحق نہ تھی۔ فن رضا جوئی میں وہ ضرور مشاق تھے۔ مگر اس موقع پر اُن کی عقل نے کچھ کام نہ دیا۔ انہیں ایسا کوئی جادو نظر نہیں آتا تھا۔ جو اُٹھتی ہوئی کالی گھٹاؤں اور زور پکڑتے ہوئے جھونکوں کو روک دے۔ کچھ دیر تک وہ اُنہیں خیالوں میں خاموش کھڑے رہے۔ بعد ازاں بولے۔" آخر گرجن۔ اب تم کیا چاہتی ہو" ÷

گرجا نے نہایت ناہمدردانہ بے پروائی سے منہ پھیر کر کہا۔ "کچھ نہیں" ÷

دیاشنکر۔ نہیں کچھ تو ضرور چاہتی ہو۔ ورنہ چار دن تک بے آب ودانہ رہنا کیا معنی! کیا مجھ پر جان دینے کی ٹھانی ہے؟ اگر یہی فیصلہ ہے۔ تو بہتر ہے۔ تم یوں جان دو۔ اور میں قتل کے جرم میں پھانسی پاؤں۔ قصّہ تمام ہوتے ہو جائے۔ اچھا ہوگا۔ بہت اچھا ہوگا۔ دنیا کی پریشانیوں سے نجات ہو جائے گی:

یہ منتر بالکل بے اثر نہ رہا۔ گرجا آبدیدہ ہو کر بولی "تم خواہ مخواہ مجھ سے جھگڑنا چاہتے ہو۔ اور مجھے جھگڑے سے نفرت ہے۔ میں نہ تم سے بولتی ہوں۔ اور نہ چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے بولنے کی تکلیف گوارا کرو۔ کیا آج شہر میں کہیں ناچ نہیں ہوتا۔ کہیں ہاکی میچ نہیں ہے۔ کہیں شطرنج نہیں بچھی ہوئی ہے۔ وہیں تمہاری طبیعت جمتی ہے۔ آپ وہیں جائیے۔ مجھے اپنے حال پر رہنے دیجئے۔ میں بہت اچھی طرح ہوں":

دیاشنکر۔ رقت آمیز لہجہ میں بولے "کیا تم نے مجھے ایسا بے وفا سمجھ لیا ہے"؟

گرجا۔ جی ہاں۔ میرا تو یہی تجربہ ہے:

دیاشنکر۔ تو تم سخت غلطی پر ہو۔ اگر تمہارا یہی خیال ہے۔ تو میں کہہ سکتا ہوں۔ کہ عورتوں کے ضمیر شناسی کے متعلق میں نے

جتنی روائتیں سنی ہیں۔ وہ سب لغو ہیں۔ گرجن! میرے بھی دل ہے۔۔" گرجا نے بات کاٹ کر کہا " واقعی! آپ کے بھی دل ہے! یہ آج نئی بات معلوم ہوئی"۔

ویاشنکر کچھ جھینپ کر بولے "خیر جیسا تم سمجھو۔ میرے دل نہ سہی میرے جگر نہ سہی۔ اور دماغ تو صاف ظاہر ہے۔ کہ ایشور نے مجھے نہیں دیا۔ ورنہ وکالت میں فیل کیوں ہوتا۔ تو گویا کل اعضاء رئیسہ میں میرے صرف پیٹ ہے۔ میں صرف کھانا جانتا ہوں۔ اور سچ مچ ہے بھی ایسا ہی تم نے مجھے کبھی فاقہ کرتے نہیں دیکھا۔ تم نے کئی بار دن دن بھر کچھ نہیں کھایا ہے۔ میں شکم سیری سے کبھی باز نہیں آیا۔ لیکن کئی بار ایسا بھی ہوا ہے۔ کہ دل اور جگر جس کوشش میں ناکامیاب رہے۔ وہ اسی پیٹ نے پوری کر دکھائی۔ یا یوں کہو۔ کہ بارہا اسی پیٹ نے دل اور جگر اور دماغ کا کام کر دکھایا ہے اور مجھے اپنے اس عجیب و غریب شکم پر کچھ ناز ہونے لگا تھا۔ مگر اب معلوم ہوا۔ کہ میرے پیٹ کی بیجائیاں لوگوں کو بری معلوم ہوتی ہیں۔۔۔ اس وقت میرا کھانا نہ بنے۔ میں کچھ نہ کھاؤں گا"۔

گرجا نے شوہر کی طرف دیکھا۔ چہرہ پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ جو یہ کہہ رہی تھی۔ کہ یہ آخری بات نہیں زیادہ احتیاط سے کہنی

چاہیئے تھی۔ گرجا اَور عورتوں کی طرح یہ بھول جاتی تھی۔ کہ مردوں کی روح کو بھی تکلیف ہو سکتی ہے۔ اس کے خیال میں تکلیف کے معنی جسمانی تکلیف تھے۔ اُس نے دیا شنکر کے ساتھ اَور جو چاہیے رعایت کی ہو۔ کھانا کھلانے پلانے میں اس نے کبھی رو رعایت نہیں کی۔ اور جب تک غذا کی روزانہ مقدار اُن کے شکم میں پہنچتی جائے اُسے اُن کی طرف سے کوئی زیادہ اندیشہ نہیں ہوتا تھا۔ ہضم کرنا دیا شنکر کا کام تھا۔ سچ پوچھئے۔ تو گرجا ہی کی سخت گیریوں نے اُنہیں ہاکی کا شوق دلایا۔ ورنہ اپنے اور بھلے بھائیوں کی طرح اُنہیں دفتر سے آکر حقہ اور شطرنج سے زیادہ دلبستگی ہوتی تھی۔ گرجا نے یہ دھمکی سُنی۔ تو چیں بہ چبیں ہوکر بولی " اچھی بات ہے نہ بنے گا "۔

دیا شنکر دل میں کچھ خفیف سے ہو گئے۔ انہیں اس بے رحمانہ جواب کی اُمید نہ تھی۔ اپنے کمرہ میں جاکر اخبار پڑھنے لگے۔ اودھر گرجا حسب معمول کھانا پکانے میں مصروف ہوئی۔ دیا شنکر ایسے دل شکستہ ہو گئے تھے۔ کہ انہیں خیال بھی نہ تھا۔ کہ گرجا کھانا پکا رہی ہو گی اس لئے جب نو بجے کے قریب اُس نے آکر کہا۔ کہ چلو کھانا کھالو تو وہ گو تعجب سے چونک تو پڑے۔ مگر یہ یقین آگیا۔ کہ میں نے بازی مارلی۔ جی ہرا ہوا۔ تاہم بظاہر ترش ہو کر بولے "میں نے تو

تم سے کہہ دیا تھا۔ کہ آج کچھ نہ کھاؤں گا"۔

گرجا۔ چلو تھوڑا سا کھا لو۔

دیاشنکر۔ مجھے مطلق بھوک نہیں ہے۔

گرجا۔ کیوں؟ آج بھوک کیوں نہیں لگی؟

دیاشنکر۔ تمہیں تین دن سے کیوں بھوک نہیں لگی؟

گرجا۔ مجھے تو اس وجہ سے نہیں لگی۔ کہ تم نے میرے دل کو صدمہ پہنچایا تھا"۔

دیاشنکر۔ مجھے بھی اس وجہ سے نہیں لگی۔ کہ تم نے مجھے تکلیف دی ہے"۔

دیاشنکر نے رکھائی کے ساتھ یہ باتیں کیں۔ اور اب گرجا انہیں منانے لگی۔ فوراً پانسہ پلٹ گیا۔ ابھی ایک ہی لمحہ قبل وہ اس کی خوشامدیں کر رہے تھے۔ مجرم کی طرح اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ گڑگڑا رہے تھے۔ منتیں کرتے تھے۔ اور اب بازی پلٹی ہوئی تھی۔ مجرم انصاف کی مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ محبت کی راہیں مکڑی کے جالوں سے بھی پیچیدہ ہیں۔

دیاشنکر نے دل میں عہد کیا تھا۔ کہ میں بھی اسے اتنا ہی رنج کروں گا۔ جتنا اس نے مجھے کیا ہے۔ اور تھوڑی دیر تک وہ زاہدانہ ثابت قدمی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ گرجا نے انہیں

گُدگُدایا۔ تلوے کھجلائے۔ ان کے بالوں میں کنگھی کی کتنی ہی لبھانے والی ادائیں صرف کیں۔ مگر اثر نہ ہُوا۔ تب اس نے اپنی دونوں بانہیں اُن کی گردن میں ڈال دیں۔ اور التجا اور محبّت سے لبریز آنکھیں اُٹھا کر بولی "چلو میری قسم کھا لو"۔

پھوس کی باندھ بہ گئی۔ دیا شنکر نے گرجا کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے بھولے پن اور جذبات کی سادگی نے اُن کے دل پر ایک عجیب دردناک اثر پیدا کیا۔ اُن کی آنکھیں بھی آبگوں ہو گئیں۔ آہ! میں کیسا ظالم ہوں۔ میری بیوفائیوں نے اسے کتنا رُلایا ہے تین دن تک اس کے آنسو نہیں تھمے۔ آنکھیں نہیں جھپکیں تین دن تک اس نے دانہ کی صورت نہیں دیکھی۔ مگر میرے ایک ذرا سے انکار نے۔ جھوٹے۔ نقلی انکار نے معجزہ کر دکھایا۔ کیسا نازک دل ہے! گلاب کی پنکھڑی کی طرح۔ جو مرجھا جاتی ہے۔ مگر میلی نہیں ہوتی۔ کہاں میرا اوچھا پن! خود غرضی! نفس پسندی! اور کہاں یہ بیخودی! یہ بے نفسی۔ یہ ہمّت بلند! دیا شنکر کے سینہ سے لپٹی ہوئی گرجا اُس وقت اپنی پُر زور کشش سے ان کے دل کو کھینچے لیتی تھی۔ اس نے جیتی ہوئی بازی ہار کر آج اپنے شوہر کے دل پر قبضہ پا لیا۔ اتنی زبردست فتح اُسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ آج

دیاشنکر کو محبت اور بھولے پن کی اس مورت پر جتنا ناز تھا۔ اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ذرا دیر میں وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بولے۔ ایک شرط پر چلوں گا؟

گرجا۔ کیا؟

دیاشنکر۔ اب کبھی مت روٹھنا۔

گرجا۔ یہ تو بڑی شرط ہے۔ مگر ... منظور ہے۔

دو تین قدم چلنے کے بعد گرجا نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولی "تمہیں بھی میری ایک شرط ماننی پڑے گی"؟

دیاشنکر۔ میں سمجھ گیا۔ تم سے سچ کہتا ہوں۔ اب ایسا نہ ہوگا۔

دیاشنکر نے آج گرجا کو بھی اپنے ساتھ کھلایا۔ وہ بہت بجائی۔ بہت حیلے کئے۔ کوئی سُنے گا تو کیا کہے گا یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ مگر دیاشنکر نے ایک نہ مانی۔ اور کئی لقمے گرجا کو اپنے ہاتھ سے کھلائے اور بہر بار اپنی محبت کا بیدردی کے ساتھ معاوضہ لیا۔

کھاتے کھاتے انہوں نے ہنس کر گرجا سے کہا "مجھے نہ معلوم تھا۔ کہ تمہیں منانا اتنا آسان ہے"۔

گرجا نے نیچی نگاہوں سے دیکھا۔ اور مسکرائی۔ مگر مُنہ سے کچھ نہ بولی۔

(۱)

چترکوٹ کے پاس دھن گڈھ نام کا ایک گاؤں ہے۔ کچھ عرصہ ہوا وہاں شان سنگھ اور گمان سنگھ دو بھائی رہتے تھے۔ ذات کے ٹھاکر بزرگوں کی سرفروشی کی بدولت انہیں ایک قطع زمین معافی ملی ہوئی تھی۔ کھیتی کرتے تھے۔ بھینس پال رکھی تھی۔ گھی بیچتے تھے۔ مٹھا کھاتے تھے۔ بفراغت گزران ہوتی تھی۔ ان کی ایک بہن تھی۔ دوجی نام تھا۔ بالکل اسم بامسمیٰ۔ دونوں بھائی قوی ہیکل غضب کے جفاکش تھے۔ بہن نہایت نازک اندام۔ سر پر گھڑا رکھ کر چلتی۔ تو کمر بل کھاتی تھی۔ مگر تینوں ابھی تک کنوارے تھے۔ بہ ظاہر انہیں شادی کی کوئی فکر نہ تھی۔ بڑے بھائی شان سنگھ کا خیال تھا۔ کہ چھوٹے بھائی کے ہوتے ہوئے اب میں کیا شادی کروں۔

اور چھوٹے بھائی گمان سنگھ کی غیرت گوارا نہ کرتی تھی۔ کہ بڑے
بھائی سے سبقت لے جائے + وہ کہتے تھے۔ اجی بڑے مزے
میں ہیں۔ میٹھی نیند سوتے ہیں۔ کون یہ جھنجھٹ مول لے۔ لیکن
جب گاؤں میں کوئی نائی یا برہمن لڑکے کی تلاش میں آنکلتا۔ تو
اُس کی خاطرداری اور مہمان نوازی میں دودھ اور میٹھے کی کوئی تمیز
نہ رہتی تھی۔ پرانے چاول نکالے جاتے۔ پلے ہوئے بکرے
دیوی کو چڑھائے جاتے۔ اور شیروشکر کی ندیاں بہنے لگتی تھیں۔
حتےٰ کہ اس وقت یہ برادرانہ پاس و لحاظ۔ رقیبانہ سرگرمی اور حاسدانہ
انہماک کی صورت میں ظاہر ہونے لگتا تھا۔ لگن کے دنوں میں ان
کی مہمان نوازی اُمنگ پر ہوتی تھی۔ اُن کی مہمان نوازی سے
فیض اٹھانے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ کتنے ہی نائی اور برہمن
جو اُن کی کمزوری سے واقف ہو چکے تھے۔ شادی کے مصنوعی
پیغام لے کر آتے۔ اور دو چار دن چاپ اور پوریاں کھا کر اور کچھ
نذرانہ لے کر بہت جلد برکشا بھیجنے کا وعدہ کر کے اپنی راہ لیتے۔
مگر دوسرے لگن کے موقع تک ان کی صورت نہ نظر آتی۔ گاؤں
کے منچلے لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لئے آئے دن ایک نہ ایک
سوانگ رچایا کرتے تھے۔ مگر کسی نہ کسی سبب سے یہ تمام سرگرمیاں

اکارت اور بے اثر ثابت ہوتیں۔ ہاں اگر رشتۂ اُمید قائم تھا۔ تو دوجی کی ذات سے۔ بھائیوں نے یہ طے کر رکھا تھا۔ کہ اس کی شادی اُسی جگہ کی جائے۔ جہاں سے ایک بہو مل سکے۔

(۲)

اسی اثناء میں گاؤں کا ایک بوڑھا کارندہ پرلوک کو سدھارا۔ اس کی جگہ پر ایک نوجوان صاحب تشریف لائے۔ انگریزی کی تعلیم پائے ہوئے شوقین۔ رنگین طبع۔ رسیلے۔ دیدہ باز۔ دو ہی چار دنوں میں اُنہوں نے گاؤں کے سارے پنگھٹوں اور تالابوں اور جھروکوں کا جائزہ لے لیا۔ بالآخر ان کی نظر انتخاب دوجی پر آکر پڑی۔ اس کی نزاکت اور متانت اور شرمیلے پن پر فدا ہوگئے بھائیوں سے راہ و رسم پیدا کی۔ کچھ شادی بیاہ کا چرچا چھیڑ دیا۔ حقہ تمباکو تک نوبت پہنچی۔ شام سویرے دروازے پر آنے لگے بھائیوں نے بھی ان کی خاطر تواضع شروع کی۔ پاندان مول لائے۔ قالین خریدی۔ وہ دروازہ پر آتے۔ تو دوجی فوراً پان کے بیڑے بنا کر بھیجتی۔ بڑے بھائی قالین بچھا دیتے۔ چھوٹے بھائی طشتری میں پان اور الائچی رکھ کر لاتے۔ ایک روز آپ نے فرمایا۔ جیسا تم ان سے اپنا الیشور نے چاہا تو اب کی لگن میں

بھاوج گھر میں آجائے گی۔ میں نے سب معاملہ پکّا پختہ کر لیا ہے۔"

شان سنگھ کی باچھیں کھل گئیں۔ نہایت احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا "میں اس عمر میں اب کیا شادی کروں گا۔ ہاں... کی بات چیت کہیں طے ہو جاتی۔ تو پاپ کٹ جاتا۔"

گمان سنگھ نے تاڑ کا پنکھا اُٹھا لیا۔ اور جھلتے ہوئے بولے "واہ بھیّا کیسی بات کہتے ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے"؟ للن سنگھ نے اکڑ کر شان سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بھائی صاحب کیا کہتے ہو۔ آپ کی آنگن میں دونوں ہی بھاوجیں چھما چھم کرتی ہوئی گھر میں آئیں۔ تب تو بات۔ میں ایسا کچا معاملہ نہیں رکھتا تم تو ابھی سے بوڑھوں کی سی باتیں کرنے لگے۔ تمہاری عمر کیا ہے پچاس سے آگے ہو۔ مگر دیکھنے میں تم چالیس سے بھی کم معلوم ہوتے ہو۔ آپ کی دونوں شادیاں ہوں گی۔ اور ٹیکہ کیسا ہوتا ہے بتاؤ کہ گہنے زیور کا انتظام ہے نہ؟"

شان سنگھ نے اپنے مربی کے تونس کو سیدھا کر کے کہا۔ "بھائی صاحب تمہاری ایسی نگاہ ہے۔ تو سب کچھ ہو جائے گا۔ آخر اتنے دن کما کما کر کیا کیا ہے۔"

گمان سنگھ دوسرے ہی روز گھر میں گئے۔ نقّارہ لیا۔ تمباکو

میں دو تین بوندیں عطر کی ٹپکائیں - چلم بھری - دوجی سے کہا - شربت گھول دے - اور حقّہ لاکر للن سنگھ کے سامنے رکھ دیا ؛

للن سنگھ نے ۔ ربیانہ انداز سے دو تین کش لگائے - اور بولے - نانی دو چار دن میں آیا جاتا ہے - ایسا گھر چھانٹا ہے - کہ طبیعت خوش ہو جائے - ایک بیوہ - دو لڑکیاں - ایک سے ایک حسین - بیوہ برس دو برس میں مر جائے گی - اور ایک مسلم موضع میں دو آنے کے حصّہ دار ہو جاؤ گے - گاؤں والے جو ابھی ہنستے ہیں - جل جل مریں گے - خوف یہی ہے - کہ کہیں کوئی اس بڑھیا کے کان نہ بھر دے - ورنہ سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا ؛

شان سنگھ کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں - گمان سنگھ کا رنگ فق ہو گیا - بولے - اب تو آپ ہی کا بھروسہ ہے - آپ جیسی صلاح دیں کیا جائے ؛

(۳۲)

جب کوئی شخص ہمارے ساتھ خواہ مخواہ خلوص و یگانگی کے رشتے قائم کرنے لگے - تو ہمیں سوچنا چاہیئے - کہ آیا اس میں اُس کی کوئی غرض تو مخفی نہیں ہے؟ ممکن ہے - وہ شخص بذاتہ نیک اور ہمدرد واقعہ ہوا ہو - تو دُور بینی کا تقاضا یہ ہونا چاہیئے - کہ دیکھیں

اُس کا دوسروں کے ساتھ کیا سلوک ہے۔ اگر ہم اپنی سادگی سے
اس وہم میں پڑ جائیں۔ کہ کوئی شخص محض ہم کو زیربار احسان کرنے
کے لئے ہماری حمایت اور غمگساری پر آمادہ ہے۔ تو یقینی امر ہے
کہ ہم کو دغا کا شکار بننا پڑے گا۔ کیونکہ خالص احسان پر بھی زیادہ
اعتماد کرنا اندیشہ سے خالی نہیں۔ مگر اپنی غرض کی دھن میں یہ
موٹی موٹی باتیں بھی ہماری نگاہوں سے چھپ جاتی ہیں۔ اور
دغا اپنے رنگے ہوئے لباس میں آکر ہم کو ہمیشہ کے لئے معاملہ دانی
کا سبق دے دیتی ہے۔ شان اور لمان نے غور اور فراست سے
مطلق کام نہ لیا۔ اور للن سنگھ کے پھندے روز بروز زیادہ گاڑھے
ہوتے گئے۔ بے تکلفی نے یہاں تک پاؤں پھیلائے۔ کہ بھائیوں
کی عدم موجودگی میں بھی وہ بے دھڑک مکان کے اندر گھس جاتے
اور آنگن میں کھڑے ہو کر چھوٹی بہن سے پان اور حقہ کی فرمائش
کرتے۔ ودّیا انہیں دیکھتے ہی بڑے شوق سے پان بناتی۔
پھر نگاہیں ملتیں۔ ایک شوق سے بیتاب۔ دوسری حیا سے
سمٹی ہوئی۔ پھر ہونٹوں پر تبسم کی جھلک نظر آتی۔ نگاہوں کی
طراوت پھولوں کو شگفتہ کر دیتی۔ دل آنکھوں سے باتیں کر لیتے۔
جن میں جتنا اختصار ہے۔ اُتنی ہی بلاغت ہے۔ اور جیسے دیوا

کا بھی خوف نہیں۔

اسی طرح بے تکلفیاں بڑھتی گئیں۔ وہ شوخ نگاہیاں جو پہلے باعث تفریح تھیں۔ اُن میں اضطراب اور انتظار کی کیفیت پیدا ہوئی۔ داستان فراق کو زبان گویا کی مدد کی ضرورت آتی۔ وہ دوجی جسے کبھی منہار اور بساطی کی شوق انگیز صدائیں گھر سے باہر نہ نکال سکتیں۔ اب ایک وارفتگی کے عالم میں گھنٹوں دروازہ پر صورت انتظار بنی کھڑی رہتی۔ وہ دوہرے اور گیت جنہیں وہ کبھی دل بہلاوے کے لئے گایا کرتی تھی۔ ان میں اب اسے درد اور گداز کا مزہ محسوس ہوتا۔ قصہ مختصر یہ کہ محبت کا رنگ گاڑھا ہوگیا۔

(۴)

رفتہ رفتہ گاؤں میں چرچا ہونے لگا۔ گھاس اور کانس خود بخود پیدا ہوتی ہیں۔ اکھاڑنے سے بھی نہیں جاتیں۔ اچھے پودے بڑی احتیاط سے نشو و نما پاتے ہیں۔ اس طرح بری خبریں خود بخود پھیلتی ہیں۔ روکنے سے بھی نہیں رکتیں۔

پنگھٹوں اور تالابوں کے کنارے اس موقعہ پر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ گاؤں کی بنیاین جو اپنے ترازو پر دلوں کو تولتی

تھی - اور گوالن چوپائی میں الفت کا رنگ دے کر دودھ کا دام وصول کرتی تھی - اور تمبولن چوپان کے بیڑوں سے دلوں پر اپنا رنگ جماتی تھی - یہ سب یکجا بیٹھ کر دوجی کی بے باکی اور بے شرمی کا راگ الاپتیں - غریب دوجی کو گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا ہمجولیاں اور بڑی بوڑھی عورتیں سبھی اُس پر آوازے کستیں - ہمجولیاں چہل اور چھیڑ کرتیں - بوڑھی عورتیں وبخراش طعنے مارتیں۔

مردوں تک بات پہنچی - ٹھاکروں کا گاؤں تھا - ٹھاکر لوگ بپھرے صلاح ہوئی - کہ للن سنگھ کو اس شرارت کی سزا دینی چاہئے - دونوں بھائیوں کو بُلایا - اور بولے "یارو! کیا اپنی آبرو بیچ کر بیاہ کرو گے؟

دونوں بھائی چونکے - اُنہیں اپنی شادی کی دھن میں خبر ہی نہ تھی - کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے - شان سنگھ نے کہا - تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی - صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟

ایک ٹھاکر نے جواب دیا - صاف صاف کیا کہلاتے ہو - اس شہدے للن سنگھ کا اپنے یہاں آنا جانا بند کر دو - ورنہ تم تو آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے ہو - اس کی جان کی خیریت نہیں ہے - ہم نے ابھی تک اس لئے طرح دی ہے - کہ شاید تمہاری آنکھیں

کھلیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے۔ تمہارے اُوپر اُس نے مُردے کی راکھ
ڈال دی ہے۔ شادی کیا اپنی عزت بیچ کر کر و گے؟ تم لوگ کھیت
میں رہتے ہو۔ اور ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ۔ کہ شہدا اپنا
بناؤ سنوار کئے آتا ہے۔ اور تمہارے گھر میں گھنٹوں گھُسا رہتا
ہے۔ تم اُسے اپنا بھائی سمجھتے ہو۔ تو سمجھا کرو۔ ہم تو ایسے بھائی
کا گلا کاٹ لیں۔ جو شواش گھات کرے۔

بھائیوں کی آنکھیں کھلیں۔ دوجی کی نسبت بخار کا جو گمان
تھا۔ محبت کا مرض نکلا۔ خون میں اُبال آیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں
اُڑیں۔ تیور بدلے۔ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف
غضبناک نگاہیں ڈالیں۔ جذبات اتنے گہرے تھے۔ کہ زبان
تک نہ آسکے۔ اور وہاں سے اپنے گھر چلے آئے۔

مگر دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا۔ کہ للن سنگھ سے مُٹ بھیڑ ہو گئی۔
للن سنگھ نے ہنس کر بے تکلفانہ انداز سے کہا۔ واہ بھائی
صاحب واہ! ہم تمہاری تلاش میں بار بار آتے ہیں۔ اور تم سے
ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ میں نے سمجھا آخر رات کو تو کوئی کام نہ
ہوگا۔ مگر دیکھتا ہوں۔ کہ آپ کو اس وقت بھی فرصت نہیں ہے۔
شان سنگھ نے دل کے اندر اُبلتے ہوئے شعلۂ آتشیں کو دبا

دبا کر کہا۔ "ہاں اس وقت سچ مچ فرصت نہیں" ؛

للن سنگھ۔ آخر کیا کام ہے۔ میں بھی سُنوں ؛

شان سنگھ۔ بہت بڑا کام ہے۔ تم سے چھپا نہ رہے گا ؛

للن سنگھ۔ کچھ گہنے پاتے کا بھی انتظام کر رہے ہو۔ اب لگن سر پر آ پہنچی ؛

شان سنگھ۔ اب بڑی لگن سر پر آ پہنچی ہے۔ پہلے اس کا انتظام کرنا ہے ؛

للن سنگھ۔ کیا کسی سے ٹھن گئی کیا؟

شان سنگھ۔ خوب اچھی طرح ؛

للن سنگھ۔ کس سے ؛

شان سنگھ۔ اس وقت جاؤ۔ صبح بتائیں گے ؛

(۵)

دوجی بھی للن سنگھ کے ساتھ دہلیز تک آئی تھی۔ بھائیوں کی آہٹ پاتے ہی ٹھٹک گئی۔ اور اُن سے جو باتیں ہوئیں وہ سب سُنیں اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ کہ آج یہ کیا معاملہ ہے۔ للن سنگھ کی کچھ خاطر ہوئی نہ تواضع۔ نہ حقہ نہ پان۔ کیا بھائیوں کے کان میں کچھ بھنک تو نہیں پڑی۔ کسی نے کچھ لگا تو نہیں دیا۔ اگر ایسا ہُوا

تو خیریت نہیں۔ اسی اُدھیڑ بن میں بیٹھی تھی۔ کہ بھائیوں نے کھانا پروسنے کی فرمائش کی۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھے تو ودجی نے اپنی بے گناہی اور صفائی جتانے کے لئے۔ نیز اپنے بھائیوں کے دل کا بھید لینے کے لئے کہا۔ تریا چتر بیں میں ابھی بالکل نو آموز تھی۔

"بھیا! اللن سنگھ سے کہہ دو گھر میں نہ آیا کریں۔ تم گھر میں رہو تو کوئی بات نہیں۔ لیکن کبھی کبھی تم نہیں رہتے۔ تو مجھے بہت شرم معلوم ہوتی ہے۔ آج ہی وہ تمہیں پوچھتے ہوئے چلے آئے۔ اب میں ان سے کیا کہوں۔ جب یہاں تم کو نہیں دیکھا۔ تو لوٹ گئے"۔

شان سنگھ نے بہن کی طرف طعنہ آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ اب وہ گھر میں نہ آئیں گے۔

گمان سنگھ بولے۔ ہم اسی وقت جا کر انہیں سمجھا دیں گے۔

بھائیوں نے کھانا کھایا۔ ودجی کو پھر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اُسے اُن کے تیور آج کچھ بدلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ کھانے کے بعد دونوں بھائی چراغ لے کر بھنڈارے کی کوٹھری میں گئے۔ گھر کے فاضل برتن۔ پرانے سامان۔ بزرگوں کے وقت کے ہتھیار وغیرہ اسی کوٹھری میں رکھے

تھے۔ گاؤں میں جب کوئی بکرا دیوی کے بھینٹ کیا جاتا۔ تو یہ
کوٹھری کھلتی تھی۔ آج تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اتنی رات
گئے یہ کوٹھری کیوں کھولی جاتی ہے۔ دوجی کو کسی آنے والے سانحہ
کا اندیشہ ہوا۔ وہ دبے پاؤں دروازہ پر گئی۔ تو دیکھتی ہے۔ کہ
گمان سنگھ ایک بھالی لئے پتھر پر۔ گڑ رہا ہے۔ اس کا کلیجہ دھک
دھک کرنے لگا۔ اور پیر تھرتھرانے لگے۔ وہ الٹے پاؤں لوٹنا
ہی چاہتی تھی۔ کہ شان سنگھ کی آواز سنائی دی "۔ اسی وقت ایک
گھڑی میں چلنا ٹھیک ہے۔ پہلی نیند بڑی گہری ہوتی ہے۔ خوب
غافل سوتا ہوگا"۔ گمان سنگھ بولے "اچھی بات ہے۔ دیکھو بجلی
کی دھار۔ ایک ہاتھ بھرپور پڑ جائے گا۔ تو کام تمام ہے"۔

دوجی کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ گویا کسی نے پہاڑ سے دھکیل
دیا۔ ساری باتیں اس کی سمجھ میں آگئیں۔ وہ ایک وحشت کے
عالم میں گھر سے نکلی۔ اور للن سنگھ کی چوپال کی طرف چلی۔ مگر
آہ! اندھیری رات۔ وادیِ عشق تھی۔ اور وہ راستہ راہ محبت۔
وہ اس سنسان تاریکی میں چونکی ہوئی آنکھوں سے اِدھر اُدھر
تاکتی۔ عالم مدہوشی میں تیزی سے قدم بڑھائے چلی جاتی تھی۔
مگر وائے ناکامی۔ ایک ایک قدم اسے منزل یار سے دور لئے

جاتا تھا۔ اُس اندھیرے سناٹے میں وہ گم گشتہ راہِ الفت۔ نہ جانے
کہاں چلی جاتی تھی۔ کس سے پوچھے۔ حیا زبان کو روکے ہوئے
تھی۔ کہیں چوڑیاں پردہ فاش نہ کر دیں۔ گہنے کمبخت کیا آج ہی
جھنکیں گے۔ آخر وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ سب چوڑیاں
توڑ ڈالیں۔ گہنے اتار کر آنچل میں باندھ لئے۔ مگر آہ! یہ چوڑیاں سہاگ
کی چوڑیاں تھیں۔ اور گہنے سہاگ کے گہنے تھے۔ جو ایک بار اُتر
کر پھر پہننے نصیب نہ ہوئے۔

اُسی درخت کے نیچے پسولی ندی سنگریزوں سے ٹکراتی ہوئی
بہتی تھی۔ جہاں کشتیوں کا گزر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جی میں سوچتی ہوئی
تھی۔ کیا میری زندگی ہی میں محبت کی کشتی مصیبت کی چٹانوں
سے ٹکرا کر ڈوب جائے گی۔

(۶)

صبح کو سارے گاؤں نے حیرت سے سنا کہ ٹھاکر الم سنگھ
کو کسی نے قتل کر ڈالا۔ سارے گاؤں کے سر دار۔ بوڑھے
جوان ہزاروں کی تعداد میں چوپال کے سامنے جمع ہو گئے۔
[illegible] ہوئے تھے۔ [illegible] کسان ہل لیے
ٹھٹھر گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ستم کس نے ڈھایا۔

کیسا ملنسار ہنس مکھ۔ نیک آدمی تھا۔ اس کا ایسا کون سا لاگی
تھا۔ بیچارے نے کسی پر اضافہ لگان یا بیدخلی کی نالش تک نہیں
کی۔ کسی کو دو بات بھی نہیں کہی۔ دونوں بھائیوں کی آنکھوں
سے آنسو کی ندی جاری تھی۔ اُن کا گھر اُجڑ گیا۔ ساری اُمیدوں
پر پانی پھر گیا۔ گمان سنگھ نے رو کر کہا۔ ہم تین بھائی تھے۔
اب دو ہی رہ گئے۔ ہم سے تو دانت کاٹی روٹی تھی۔ ساتھ اُٹھنا
بیٹھنا۔ ہنسی۔ دل لگی۔ کھانا پینا۔ بالکل شیر و شکر ہو گئے تھے۔
مگر ظالم سے یہ بھی نہ دیکھا گیا۔ ہائے اب ہم کو کون سہارا دیگا
شان سنگھ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں بھائی کپاس
نروانے جا رہے تھے۔ للن سنگھ سے کئی دن سے ملاقات
نہ ہوئی تھی۔ سوچے ادھر سے ہوتے چلیں۔ مگر پچھواڑے
آتے ہی بھینس نظر آئی۔ ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ دروازہ
پر جا کر دیکھا۔ تو چوکیدار۔ شحنہ۔ سپاہی سب خراٹے لے
رہے ہیں۔ انہیں جگا کر للن سنگھ کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے
مگر بہت کوشش کرنے پر بھی دروازہ اندر سے نہ کھلا۔ تو
بھینس سے جھانکا۔ آہ کلیجہ میں ایک تیر لگ گیا۔ دنیا آنکھوں
میں تاریک سی ہو گئی۔ پیارے للن سنگھ کا سر دھڑ سے الگ تھا۔

خون کی ندی بہ رہی تھی۔ افسوس بھیّا سدا کے لئے داغ دے گئے۔

دوپہر تک یوں ہی ماتم ہوتا رہا۔ دروازہ پر میلہ سا لگا ہوا تھا۔ دور دور سے لوگ اس سانحہ کی خبر پا کر جمع ہوتے ہوتے حلقہ کے داروغہ صاحب بھی چوکیداروں اور سپاہیوں کی جمعیت لئے ہوئے آ پہنچے۔ کڑھاؤ چڑھ گیا۔ گوشت اور پوری کی تیاری ہونے لگی۔ داروغہ جی نے تحقیقات کرنی شروع کی۔ موقع دیکھا چوکیداروں کے بیان لئے۔ دونوں بھائیوں کے اظہار لکھے قرب و جوار کے پاسی۔ اور چمار پکڑے گئے۔ اور ان پر مار پڑنا شروع ہوئی۔ صبح کو وہ ان غریبوں کو گرفتار کئے۔ للن سنگھ کی لاش کو ساتھ کر تھانہ گئے۔ قاتل کا پتہ نہ چلا۔ جوتوں اور ہنٹروں کی پوچھ پاٹ بھی کارگر نہ ہوئی۔ دوسرے دن انسپکٹر پولیس تشریف لائے۔ انھوں نے بھی گاؤں کا چکر لگایا۔ چماروں اور پاسیوں کی پھر مرمت ہوئی۔ پھر حلوا پوری اور گوشت کی اُڑی۔ شام کو وہ بھی واپس ہوئے۔ چند پاسیوں پر جو کئی بار ڈاکہ اور سرقہ کے جرم میں ماخوذ ہو چکے تھے۔ شبہ ہوا ان کا چالان کیا گیا۔ [illegible] شہادتیں زبردست پائیں۔ [illegible]

کو سشن سپرد کیا۔ اور وعدہ معشوق کی طرح مقدمہ کی پیشیاں ہونے لگیں ٭

دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا۔ کچھ ترشح ہو رہا تھا۔ سشن جج کنور بہنے کرشن بجھیلا کے اجلاس میں مقدمہ پیش تھا۔ کنور صاحب بڑے پس و پیش میں تھے۔ کہ کیا کریں ملزموں کے خلاف شہادت بہت کمزور تھی۔ مگر وکیل سرکار جو ایک بڑے مشہور مقنن تھے۔ نظیروں پر نظیریں پیش کرتے جاتے تھے۔ کہ دفعتاً دوجی ایک سفید ساڑی پہنے۔ گھونگٹ نکالے ہوئے بے خوف عدالت کے کمرہ میں آئی۔ اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔ سرکار! میں شان سنگھ اور گمان سنگھ کی بہن ہوں۔ اس معاملہ میں میں جو کچھ جانتی ہوں۔ وہ مجھ سے بھی سن لیا جائے۔ اس کے بعد سرکار جو فیصلہ چاہے کریں ٭

کنور صاحب نے حیرت سے دوجی کی طرف دیکھا۔ شان سنگھ اور گمان سنگھ کے بدن میں کاٹو تو لہو نہیں۔ وکیلوں نے بھی استعجاب کی نگاہ سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ دوجی کے چہرہ پر اس وقت متانت اور استقلال سے نور تھا۔ وحشت یا سراسیمگی کا مطلق پتہ نہ تھا۔ ندی طوفان کے بعد شانت ہو چکی

تھی۔ اُس کے دلفریب حُسن اور اس کی سادگی نے مل جُل کر اس کے چہرہ پر ایک روحانی جلال کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس نے اُسی روانی میں کہنا شروع کیا۔ ٹھاکر للن سنگھ کو قتل کرنے والے میرے دونوں بھائی ہیں ؎

کنور صاحب کی آنکھوں کے سامنے پردہ سا ہٹ گیا۔ ساری عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ اور سب نگاہیں دوجی کی طرف جم گئیں ؎

دوجی بولی۔ یہ وہ بھجالی ہے۔ جو للن سنگھ کی گردن پر پھیری گئی ہے۔ ابھی اس کا خون تازہ ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بھائیوں کو اسے پتھر پر رگڑتے دیکھا۔ ان کی باتیں سنیں۔ میں اُسی وقت گھر سے نکلی۔ کہ للن سنگھ کو ہوشیار کردوں۔ مگر میرے نصیب کھوٹے تھے۔ چوپال کا ٹھکانہ نہ ملا۔ میرے دونوں بھائی کھتری ہیں۔ وہ مرد ہیں۔ میرے سامنے جھوٹ کبھی نہ بولیں گے۔ ان سے پوچھ لیا جائے۔ اور جو سچ پوچھئے۔ تو یہ چھری میں نے چلائی ہے۔ میرے بھائیوں کا قصور نہیں۔ یہ سب میری تقدیر کا کھیل ہے۔ یہ سب کرتوت میں نے کی۔ یہ سب میرے پیچھے ہوا۔ اور انصاف کی تلوار میری ہی گردن

پر پڑنی چاہئے - میں ہی اپرادھنی ہوں - اور میں ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں - کہ اسی بھجالی سے میری گردن کاٹ دی جائے ؞

---(۷)---

عدالت میں ایک عورت ہلال عید کی شان رکھتی ہے - اب تک مقدمہ بالکل خشک اور بے مزہ تھا - دوجی کی آمد نے اُس میں ندرت اور دلچسپی پیدا کر دی - عدالت کے کمرہ میں ایک بھیڑ لگ گئی - موکل اور وکیل - عملے اور دکان دار - سبھی ایک بیتابانہ جوش کے ساتھ اودھر اُدھر سے دوڑے چلے آتے تھے - ہر شخص اسے ایک نظر دیکھنے کا مشتاق تھا - ہزاروں نگاہیں اُس کے چہرے کی طرف جمی ہوئی تھیں - اور وہ اس خلقت کے بیچ میں متانت کی ایک مورت بنی ہوئی بے حس و حرکت کھڑی تھی ؞

اس واقعہ پر ہر کس و ناکس اپنی سمجھ کے مطابق رائے زنی کرتا تھا - بوڑھے کہتے تھے غضب کی بیباک عورت ہے - ایسی لڑکی کا تو سر کاٹ لینا چاہئے - بھائیوں نے وہی کیا جو مردوں کا کام تھا - اس بیحیائی کو تو دیکھو - کہ اپنا پردہ ڈھکا رکھنے کے بجائے اپنے آپ کو رسوا کرتی پھرتی ہے - اور بھائیوں کو بھی دبائے دیتی ہے - آنکھ کا پانی گر گیا ہے - ایسی نہ ہوتی تو یہ دن ہی کیوں آتا ؞

مگر نوجوان آزادی پر جان دینے والے وکیلوں اور عملوں میں اُسی جُرأت اور بیباکی کی تعریفیں ہو رہی تھیں۔ ان کے خیال میں جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ تو بھائیوں کا فرض تھا۔ کہ دونو کی شادی کر دیتے۔ رنگین طبع حضرات کو عشق خانہ خراب کی یاد آئی۔ امیرؔ اور داغؔ کے اشعار پڑھنے لگے؛

کئی جگہ چند سن رسیدہ وکیلوں کی اپنے نوجوان دوستوں سے گرما گرم بحث ہو گئی۔ ایک فیشنیبل بیرسٹر صاحب نے ہنس کر فرمایا؛

یار اور تو جو کچھ ہے۔ سو ہے۔ عورت ہزاروں میں انتخاب ہے۔ رانی معلوم ہوتی ہے۔ عام رائے نے اس پر صاد کیا۔ کنور بینے کرشن اسی وقت اجلاس سے اُٹھے تھے۔ بیرسٹر صاحب کا ریمارک سنا۔ اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔ وہ سوچ رہے تھے۔ کہ جس عورت کے انتقام میں اتنی جلن ہے۔ کیا اس کی محبّت میں بھی اتنی ہی گرمی ہوگی؛

(۸)

دوسرے دن پھر دس بجے مقدمہ پیش ہوا۔ کمرہ میں تل رکھنے کی بھی جگہ باقی نہ تھی۔ دو جی کٹہرے کے پاس سر جھکائے

کھڑی تھی۔ دونوں بھائی کٹی کانسٹیبلوں کے حلقہ میں دم بخود ایستادہ تھے۔ کنور بنے کرشن نے اُن کی طرف مخاطب ہو کر بلند آواز سے کہا۔ ٹھاکر شان سنگھ اور رگمان سنگھ! تمہاری بہن نے تمہارے متعلق عدالت میں جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟

شان سنگھ نے مردانہ انداز سے جواب دیا۔ اُس نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس لئے چھپایا تھا۔ کہ ہم بدنامی اور بے عزتی سے ڈرتے تھے۔ لیکن اب کہ ہماری بدنامی جو کچھ ہونا تھی وہ ہو چکی۔ تو ہم کو اپنی صفائی دینے کی ضرورت نہیں۔ ایسی زندگی سے اب مرجانا ہی بہتر ہے للن سنگھ سے ہماری گہری دوستی تھی۔ آپس میں کوئی پردہ نہ تھا۔ ہم اُسے اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ لیکن اُس نے ہم سے دغا کی۔ اس نے ہمارے خاندان میں کلنک لگایا۔ اور ہم نے اُس کا بدلہ لیا۔ اُس نے چکنی میٹھی باتوں کے بدلہ میں ہماری عزت لینی چاہی۔ لیکن ہم اپنی خاندانی عزت کو اتنی سستی نہیں بیچ سکتے تھے۔ عورت خاندان کی عزت کا سرمایہ ہوتی ہے۔ مرد اس کے رکھوالے ہوتے ہیں۔ جب اس سرمایہ پر دغا یا

فریب کا ہاتھ اُٹھے تو مردوں کا دھرم ہے۔ کہ وہ اپنے سرمایہ کو اس سے بچائیں۔ اس سرمایہ کو عدالت کا قانون۔ پرماتما کا خوف یا عزت کی صفائی نہیں بچا سکتی۔ ہم کو اس کے لیے عدالت سے جو سزا ملے۔ اس کے لئے سر جھکائے ہوئے ہیں۔

جج نے نشان سنگھ کی تقریر سُنی۔ عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ اور اُس عالم خموشی میں انہوں نے اپنا فیصلہ سنایا۔ دونوں بھائیوں کو قتل عمد کے جرم میں حبس دوام عبور دریائے شور کی سزا ملی۔

(۹)

شام ہو گئی تھی۔ دونوں بھائی کانسٹبلوں کے حلقہ میں عدالت سے باہر نکلے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ پیروں میں بیڑیاں آنکھوں میں غیرت پامال۔ دل اپنی ذلت و بدنامی سے بیٹھے اور سر شرم کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ جس طرح ندی کی لہر جوش سے متوالی۔ گرجتی ہوئی کراروں سے ٹکرا کر پھر پیچھے کی طرف گرتی ہے۔ اُسی طرح دونوں بھائیوں کا جوش ایک بار زور سے بھبک کر اب بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا۔ گویا ساری دنیا ہمارے اوپر ہنس رہی ہے۔ آفتاب کی زرین کرنیں سامنے کے درختوں سے گلے مل رہی تھیں۔ اُن پر چڑیاں میٹھی

بیٹھی ہوئی وہی کرتی تھیں۔ جو آسودگی محلوں میں کیا کرتی ہے۔ کیا وہ بھی دیکھ کر ہنستی تھیں!

دونوں بھائی اُسی طرح سر جھکائے اس درخت کے نیچے سے گزرے۔ دوجی زمین پر بیٹھی تھی۔ اُس نے قیدیوں کے آنے کی آواز سُنی۔ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بھائیوں نے بھی اُس کی طرف تاکا۔ مگر آہ! انہیں ایسا معلوم ہُوا۔ کہ یہ ہمارے اوپر ہنس رہی ہے۔ نفرت سے آنکھیں پھیرلیں۔ دوجی نے بھی انہیں دیکھا مگر نفرت یا غصہ سے نہیں۔ صرف ایک بے تعلقانہ انداز سے جن بھائیوں پر وہ جان دیتی تھی۔ وہی دونوں بھائی آج اُس کالے پانی کو جا رہے ہیں۔ جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ اور اُس کے خون میں ذرا بھی حرکت۔ ذرا بھی جنبش نہیں ہوتی۔ خون بھی خارجی اثرات سے پانی کی طرح جم جاتا ہے۔

آفتاب کی کرنیں درختوں کی ڈالیوں سے ملیں۔ پھر جھڑ ول کے قدم چومتی ہوئی رخصت ہوگئیں۔ مگر اُن کے لئے گوشۂ تاریک گود پھیلائے ہوئے تھا۔ کیا اس بدنصیب عورت کے لئے بھی دنیا میں کوئی ایسا گوشۂ تاریک تھا۔

آسمان سُرخ سے نیلگوں ہُوا۔ تاروں کے کنول کھلے ہوا

کے لئے پھولوں کے بیج بچھ گئے۔ شبنم کے لئے سبز مخمل کا فرش بچ گیا۔ مگر غم نصیب دوجی اُسی درخت کے نیچے بے حس وحرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے لئے دنیا میں کوئی جگہ نہ تھی۔ جسے اب تک وہ اپنا گھر سمجھتی تھی۔ اُس کے دروازے اس کے لئے بند تھے۔ وہاں وہ کون سا منہ لے کر جائے گی۔ ندی کا اپنے مخرج سے نکل کر اتھاہ سمندر کے سوا اور کہیں ٹھکانا نہیں ہے ؛۔

دوجی اسی طرح بیٹھی ہوئی یاس کے بحر بے پایاں میں غوطے لگا رہی تھی۔ کہ ایک بوڑھی عورت اُس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ دوجی چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ ضعیفہ نے اس کی طرف حیرت سے دیکھ کر کہا۔ بیٹی! اتنی رات گئی۔ اور تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو؟ دوجی نے چمکتے ہوئے تاروں کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ کہاں جاؤں؟

ان الفاظ میں بیکسی اور بے بسی کی کتنی داستان چھپی ہوئی تھی۔ کہاں جائے! دنیا میں اُس کے لئے بجز کوچۂ رسوائی کے اور کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ضعیفہ نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ بیٹی۔ نصیبوں میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ تو پورا ہو کر ہی رہے گا۔ مگر

تم یہاں کب تک بیٹھی رہوگی؟ میں غریب برہمنی ہوں۔ چلو میرے گھر رہو۔ جو کچھ مانگے جا مجھے ملے گا۔ اسی میں ہم دونوں نباہ کریں گے۔ معلوم نہیں پچھلے جنم میں تم سے کیا ناتا تھا۔ جب سے تمہارا حال سُنا ہے بےچین ہو رہی ہوں۔ آج سارے شہر میں گھر گھر تمہارا ہی چرچا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی کچھ۔ لے اُٹھو۔ یہاں اس سنّاٹے میں پڑے رہنا اچھّا نہیں۔ زمانہ خراب ہے۔ میرا گھر یہاں سے تھوڑی ہی دور ہے۔ نارائن کا دیا بہت کچھ ہے۔ میں بھی اکیلی سے دُکیلی ہو جاؤں گی۔ بھگوان کسی نہ کسی طرح دن کاٹ ہی دیں گے۔

ایک گھنے بھیانک جنگل میں بھٹکا ہُوا آدمی جدھر پگڈنڈیوں کے نشان دیکھتا ہے۔ اسی طرف ہو لیتا ہے۔ اور یہ نہیں سوچتا کہ یہ راستہ مجھے کہاں لے جائے گا۔ دوجی کی بھی یہی کیفیت تھی ذلت اور مایوسی پست ہمتی کو بھی ساتھ لاتی ہے۔ دوجی اس بوڑھی عورت کے ساتھ چلی۔ اتنی ہی خوشی سے وہ اُس کے کہنے پر کنوئیں میں کود پڑتی۔ ہوا میں منڈلاتی ہوئی چڑیا دانہ پر گری۔ کیا اس دانہ کے نیچے جال بچھا ہُوا تھا؟

(۱۰)

دوجی کو بوڑھی کیلاشی کے ساتھ رہتے ہوئے ایک مہینہ گذر گیا۔ کیلاشی دیکھنے میں غریب۔ لیکن دل کی غنی تھی۔ اُس کے پاس قناعت کی دولت تھی۔ جو کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتی۔ ریوان کی سرکار سے قلیل وظیفہ ملتا تھا۔ یہی اُس کی زندگی کا سہارا تھا۔ وہ ہمیشہ دوجی کی تشفی کرتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا دونوں ماں بیٹیاں ہیں۔ ایک طرف سے کامل ہمدردی اور تشفی۔ دوسری طرف سے سچی خدمت گزاری اور عقیدت کیلاشی جانتی تھی۔ کہ غمناک خیالات تنہائی کے منتظر رہتے ہیں۔ اس لئے وہ دوجی کو کبھی سوچنے یا بسورنے کا کوئی موقعہ نہ دیتی۔ وہ کچھ ہندی جانتی تھی۔ اور کبھی کبھی دوجی کو رامائن اور سیتا چرتر پڑھ کر سناتی۔ دوجی ان کتھاؤں کو بڑے شوق سے سنتی۔ سادے کپڑے پر رنگ خوب چڑھتا ہے۔

جس دن سیتا کے بن باس کی کتھا سُنی۔ دوجی سارے دن روتی رہی۔ سوئی تو سیتا اُس کے سامنے کھڑی تھیں۔ اُن کے بدن پر سفید ساری تھی۔ آنکھوں میں آنسو اور آنسو کے پردے میں پیار چھپا ہُوا تھا۔ دوجی ہاتھ پھیلائے بچوں کی طرح اُن کی

طرف دوڑی۔ ماتا مجھے بھی ساتھ لیتی چلو۔ میں جنگل میں تمہاری سیوا
کروں گی۔ تمہارے لئے پھولوں کی سیج بچھاؤں گی۔ تمہیں کمل
کے تھالوں میں پھلوں کے جیونار کھلاؤں گی۔ تم وہاں اکیلے
ایک بوڑھے سادھو کے ساتھ کیسے ہو گی۔ میں تمہارا دل بہلاؤں
گی۔ جس وقت بن میں ہم اور تم کسی ساگر کے کنارے گھنے درختوں
کی چھاؤں میں بیٹھیں گے۔ اُس وقت ہوا کی دھیمی دھیمی لہروں
کے ساتھ میں گاؤں گی +
سیتا نے اُس کی طرف پیار سے دیکھ کر کہا۔ نادان ساگر کا
کنارہ اور گھنے درختوں کی چھاؤں۔ دھیمی ہوا کے جھونکے۔ اور
ساگر کی مدھم لہریں۔ کیا تو ان کو خوشی کے سامان سمجھتی ہے۔
انہوں نے مجھے بہت رلایا ہے۔ تجھے بھی رُلائیں گی +
دوجی نے مایوسانہ انداز سے پوچھا۔ تو میں کہاں جاؤں؟
سیتا بولیں۔ تو وہاں جا جہاں دُکھ ہے۔ جہاں تکلیف ہے
سورج کی روشنی کنول کے لئے ہے۔ جس کا کھلنا آنکھوں
کو لبھاتا ہے۔ تیرے لئے اندھیری۔ ڈراؤنی رات ہے۔ تو وہاں
جا جہاں دُھارس کی آواز۔ اور محبت کی خاطر داریاں۔ اور
خوشی کا خیال۔ ان میں سے ایک بھی نہ ہو۔ ہوا سے پانی میں

ترنگیں اُٹھنے لگتی ہیں چنچل من کا یہی حال ہے ٭

صبح اُٹھتے ہی دوجی نے کیلاشی سے کہا۔ امّاں میں وہاں جاؤں گی۔ جہاں دُکھ اور تکلیف ہے۔ جہاں مجھے کسی آدمی کی آواز بھی نہ سُنائی دے۔ جہاں جنگل کے ڈراؤنے جانور اور پہاڑوں کی اندھیری گپھائیں ہوں۔ خوشی اور محبّت میرے تقدیر میں نہیں ہے۔ مجھے اُن سے دُور بھاگنا چاہئے ٭

کیلاشی نے تعجب سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور بولی۔ کیوں بیٹی تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟

دوجی کے آنکھوں میں آنسو بہ آئے۔ اس نے جواب دیا۔ سیتا مہارانی کا یہی حکم ہے۔ آج مجھے اُن کے درشن ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ تو وہاں جا۔ جہاں دُکھ اور تکلیف ہو۔ کیونکہ محبّت کی خاطرداریاں من کو چنچل کر دیتی ہیں ٭

کیلاشی سہم گئی۔ دوجی کو سمجھا کر بولی۔ بیٹی تو نے سپنا دیکھا ہے۔ سپنے کی باتوں کا کون ٹھکانہ۔ مصیبت کا زمانہ برسات کی رت ہے۔ اوپر کالی گھنگھور گھٹا نیچے اُمڈی ہوئی ندی دندی کو دیکھو تو وار پار نہیں۔ گھٹا کو دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اندر نے سمندر کو اوپر لٹکا دیا ہے۔ مگر دو ہی چار دن میں پھر

سورج کی چمک آتی ہے۔ اور سر پر چڑھنے والی ندی پیروں کو چومتی ہے۔ اس طرح دل مت چھوٹا کرو۔ یہ دن جلد کٹ جائیں گے میں ان ہاتھوں میں سہانی چوڑیاں پہناؤں گی۔ میں اس مانگ کو موتیوں سے بھروں گی۔ میں تمہارا بیاہ رچاؤں گی۔ اور ایسا بر ڈھونڈھوں گی۔ جس کی چیری بننے کے لئے بڑے بڑے ریئسوں کی بیٹیاں ترستی ہیں۔ وہ تمہیں آنکھوں کی پتلی بنا کر رکھے گا۔ اور اپنے بھاگ کو سراہے گا۔

آسمان کے نیلگوں سمندر میں تارے حباب کی طرح مٹتے جاتے تھے۔ ودچی نے ان جھلملاتے ہوئے غم نصیب تاروں کی طرف دیکھا۔ یہ آسمان پر رہیں گے۔ مگر نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ میں بھی انہیں کی طرح سب کی آنکھوں سے چھپ جاؤں اُنہیں بلبلوں کی طرح مٹ جاؤں۔

بادہ پرستوں کی رات شروع ہوئی۔ بلاکشان محبت جاگے۔ چکیوں نے اپنے سہانے راگ چھیڑے۔ کیلاشی اشنان کرنے چلی۔ تب ودچی اٹھی اور وہاں چلی جہاں ڈھارس کی آواز۔ اور محبت کی خاطرداریاں۔ اور خوشی کا خیال اُن میں سے ایک بھی نہ ہو۔ چڑیا بے بال و پر ہونے پر بھی سنہرے پنجرے میں نہ رہ سکی۔

(۱۱)

روشنی کی ایک دھندلی سی جھلک میں کتنی اُمید۔ کتنی قوت۔ کتنا استقلال ہے۔ یہ اُس آدمی سے پوچھو جسے تاریکی نے ایک گھنے جنگل میں گھیر لیا ہو۔ روشنی کی وہ جھلک اُس کے لڑکھڑاتے ہوئے پیروں کو سُبک اور تیز بنا دیتی ہے۔ اُس کے تن خستہ میں ایک جان سی پڑ جاتی ہے۔ جہاں ایک ایک قدم رکھنا دشوار ہو جاتا تھا۔ وہاں اس شعلۂ حیات کو دیکھتے ہوئے وہ میلوں۔ کوسوں۔ ایک عاشقانہ جوش کے ساتھ بڑھتا ہُوا چلا جاتا ہے۔

مگر دوجی کے لئے اُمید کی یہ جھلک کہاں تھی۔ وہ بھوکی۔ پیاسی۔ ایک عالم وحشت میں چلی جاتی تھی۔ معلوم نہیں کہاں۔ شاید اس جگہ جہاں ہمدردی کی آواز اور خوشی کا خیال بھی نہ ہو۔

شہر پیچھے چھوٹا۔ باغ اور کھیت آئے۔ کھیتوں میں شگفتہ ہریالی باغوں میں خزاں کا دور۔ میدان اور پہاڑ ملے۔ میدانوں سے بانسری کی مدھم اور سہانی آوازیں آتی تھیں۔ پہاڑوں کی بلندیاں موروں کی جھنکار سے گونج رہی تھیں۔ یہ آنے والے پھولوں کے خیر مقدم کے نغمے تھے۔

دن چڑھنے لگا۔ سورج اُس کی طرف آتا ہُوا دکھائی دیا۔

کچھ دیر تک اُس کے ساتھ رہا۔ شاید روٹھے کو مناتا تھا۔ پھر اپنی راہ چلا گیا۔ بسنت کی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ کھیتوں نے کُہرے کی چادریں اوڑھ لیں۔ رات ہو گئی۔ اور دوجی ایک اونچے پہاڑ کے دامن میں جھاڑیوں سے اُلجھتی چٹانوں سے ٹکراتی چلی جاتی تھی۔ گویا کسی جھیل کے ہلکے تلاطم میں کنارے پر اُگے ہوئے ننھے سے جھاؤ کے درخت کا سایہ تھر تھرا رہا ہو۔

اس طرح نامعلوم کی تلاش میں وہ یکہ و تنہا۔ بےخوف و خطر گرتی پڑتی چلی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ بھوک۔ سردی۔ اور تکان سے اُس کی طاقتوں نے جواب دے دیا۔ وہ بیدم ہو کر ایک چٹان پر بیٹھ گئی۔ اور سہمی ہوئی نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ داہنے اور بائیں۔ اونچی منجمد تاریکیاں تھیں۔ جن کی سروں پر تارے جگمگا رہے تھے۔ سامنے ایک ٹیلہ راستہ روکے ہوئے کھڑا تھا۔ اور قریب ہی سے کسی جوئے رواں کی ہلکی۔ دبی ہوئی سائیں سائیں سنائی دیتی تھی۔

(۱۲)

دوجی کو تھکن کے باوجود نیند نہیں آئی۔ مارے سردی کے کلیجہ کانپ رہا تھا۔ ہوا کے بیرحم جھونکے ذرا بھی چین نہ لینے دیتے

تھے۔ ذرا دیر کے لئے آنکھیں جھپک جاتیں۔ اور پھر وہ چونک پڑتی۔ رات اسی طرح گزری۔ صبح ہوئی چٹان سے ذرا دور پر ایک گھنا پاکر کا درخت تھا جس کی جڑیں خشک۔ پتھروں سے چمٹ کر اُن سے قوت نمویوں حاصل کرتی تھیں۔ جس طرح کوئی مہاجن مفلس اسامیوں کو جکڑ کر اُن سے سود کے روپلے وصول کرتا ہے۔ اس درخت کے مقابل پہاڑ کے دامن میں کئی چھوٹی چھوٹی چٹانوں نے مل کر ایک حجرہ کی صورت بنا رکھی تھی۔ داہنی طرف کوئی دو سو گز کے فاصلہ پر نشیب میں پسونی ندی چٹانوں اور سنگریزوں سے اُلجھتی پیچ و تاب کھاتی ہوئی بہ رہی تھی۔ جس طرح کوئی مضبوط ارادے کا انسان رکاوٹوں کی پروا نہ کرکے منزل مقصود کی طرف بڑھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اس ندی کے کنارے صوفی مشرب بگلے چپ چاپ دھیان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مَتیں مرغابیاں قناعت آمیز انداز سے پانی میں تیرتی تھیں۔ حریص ٹٹھریاں ندی کے اوپر منڈلاتی تھیں۔ اور رہ رہ کر مچھلیوں کی تلاش میں ٹوٹتی تھیں۔ کھلاڑی مینے بیفکری سے پروں کو کھجا کھجا کر نہاتے تھے۔ اور مصلحت پسند کوّے غول کے غول کسب معاش کے مسئلہ کو حل کرنے کی فکر میں تھے۔ ایک

درخت کے نیچے موروں کی محفل آراستہ تھی۔ اور درخت کی ڈالیوں پر فاختائیں سرگرم رازونیاز تھیں۔ ایک دوسرے درخت پر حضرت زاغ اور پنڈت نیل کنٹھ زور شور کے ساتھ نبرد آزمائی میں مصروف تھے۔ حضرت زاغ نے صرف چھیڑنے کے لئے پنڈت جی کے آشیانہ کی طرف جھانکا تھا۔ اس پر پنڈت جی اس قدر برہم ہوئے کہ حضرت کے پیچھے پڑ گئے۔ حضرت زاغ نے اپنی فطری دانشمندی کو کام فرما کر راہ فرار اختیار کی۔ اور پنڈت جی صلواتیں سناتے ہوئے سرگرم تعاقب ہوئے۔ بارے میاں زاغ کی تیز روی نے اُن کی جان بچائی۔

ذرا دیر میں وحشی مزاج نیل گایوں کا ایک غول آیا۔ کسی نے پانی پیا۔ کسی نے صرف سونگھ کر چھوڑ دیا۔ اور دو چار عنفوان شباب کے متوالے باہم سینگیں ملانے لگے۔ پھر ایک کالا ہرن۔ پرغرور نگاہوں سے تاکتا۔ شان سے قدم اٹھاتا۔ اپنے متعدد غزال چشموں کو ساتھ لئے ندی کے کنارے آیا۔ بچّے مؤدبانہ فاصلہ پر کلبلیں کرتے چلے آتے تھے۔ ذرا اور ہٹ کر ایک درخت کے نیچے بندروں نے اپنے ڈیرے جما رکھے تھے۔ بچّے خوش فعلیاں کرتے تھے۔ مردوں میں چیخ و چپقلش ہو رہی تھی۔ اور گھر والیاں اطمینان سے بیٹھی

ہوئی ایک دوسرے کے موے عنبریں سے جوئیں نکالتی تھیں۔ اور انہیں غنچہ وہن میں رکھتی جاتی تھیں۔ دوجی ایک چٹان پر نیم خوابی کی حالت میں بیٹھی ہوئی یہ کیفیتیں دیکھ رہی تھی۔ دھوپ نے غنودگی پیدا کی۔ آنکھیں جھپک گئیں۔ اُس نے دیکھا۔ کہ سیتا سامنے کھڑی اُس کی طرف مادرانہ شفقت سے تاک رہی ہیں۔ اُس نے اُن کے قدموں کو چوما۔ اور بولی۔ ماتا میرے لئے کیا حکم ہے؟

سیتا نے تشفی آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ بیٹی! تم اسی ندی کے کنارے۔ اُنہیں پہاڑوں کے بیچ میں اپنی مصیبت کے دن کاٹو۔ بیشک یہاں دُکھ اور تکلیف ہے۔ یہاں نہیں کسی ہمدرد کی آواز نہ سنائی دے گی۔ یہاں نہیں خوشی کے کوئی سامان نہ ملیں گے۔ مگر کیا تم نے نہیں دیکھا۔ کہ ہمدردیاں غرض سے خالی نہیں ہوتیں۔ اور خوشی کے سامان دل کو ڈانواڈول کر دیتے ہیں۔ آج سے تم اِسی ندی اور اُنہیں پہاڑوں کو اپنا ہمدرد اور انہیں قدرت کے کرشموں کو اپنی خوشی کے سامان سمجھو۔

دوجی کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے دیکھا۔ کہ ندی کا پانی کیسا شفاف ہے۔ کیا ہمدردوں کے دل بھی ایسے صاف ہوتے ہیں؟

(۱۳)

قدرت کے اسی کرشمہ زار میں دوجی نے چودہ سال بسر کیئے۔ وہ روز صبح کو اسی ندی کے کنارے چٹان پر بیٹھی یہ تماشے دیکھتی۔ اور لہروں کے دردناک نغمے سنتی۔ اسی ندی کی طرح اُس کے دل میں بھی لہریں اُٹھتیں۔ جو کبھی کبھی ضبط اور ہمت کے کناروں پر چڑھ کر آنکھوں سے بہ نکلتیں۔ اُسے معلوم ہوتا کہ جنگل کے درخت اور جانور سب اُس کی طرف طعنہ آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ندی بھی اُسے دیکھ کر غصہ سے منہ میں پھین بھر لیتی۔ جب یہاں بیٹھے بیٹھے اُس کی طبیعت اُکتا جاتی تو وہ پہاڑ پر چڑھ جاتی۔ اور دور تک نظر دوڑاتی۔ پہاڑوں کے بیچ میں کہیں کہیں مٹی کے گھروندوں کی طرح چھوٹے چھوٹے مکان نظر آتے۔ کہیں لہلہاتے ہوئے سبزہ زار۔ سارا منظر ایک نزہ تازہ باغ کی طرح دکھائی دیتا۔ اُس کے دل میں ایک بےچین کرنے والی خواہش ہوتی۔ کہ کاش میں اُڑ کر اُن چوٹیوں پر جا پہنچتی۔ پہاڑوں کی پُر فضا بلندیوں پر کتنی حسرتیں ہیں! سبزہ زار کی تازگی یاد رفتہ کو کیوں تازہ کرتی ہے۔ دوجی ندی کے کنارے۔ یا پاکر کے گھنے سایہ میں بیٹھی ہوئی گھنٹوں سوچا کرتی۔ بچپن کے وہ دن یاد آتے۔ جب وہ سہیلیوں کے گلے

میں باہیں ڈال کر مہوے چننے جایا کرتی تھی۔ پھر گڑیوں کے بیاہ یاد آتے۔ پھر اپنے پیارے گاؤں کی پنگھٹ نظروں میں پھر جاتی۔ آج بھی وہاں وہی جمگھٹ ہوگی۔ وہی ہنسی اور چہل۔ پھر اپنا گھر یاد آتا۔ وہ گائے یاد آتی جو اسے دیکھتے ہی نتھنے فراخ کر کے اپنے شوق کا اظہار کیا کرتی تھی۔ منّو یاد آتا جو اُس کے پیچھے پیچھے چھلانگیں مارتا کھیتوں میں جایا کرتا تھا۔ جو برتن دھوتے وقت بار بار برتنوں میں منہ ڈالتا۔ تب للن سنگھ آنکھوں کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے۔ لبوں پر وہی شوخ تبسم۔ آنکھوں میں وہی شرارت آمیز چمک۔ تب وہ اٹھ کھڑی ہوتی۔ اور خیالات کو دوسری طرف لے جانے کی کوشش کرتی۔

دن جاتے تھے۔ مگر بہت آہستہ آہستہ۔ بسنت آیا۔ سیمل کا حُسن احمر اور کچنال کی اودی شوخیاں اپنی بہار دکھانے لگیں۔ ٹکو کے پھول مہکے۔ گرمی شروع ہوئی۔ صبح کو صبا کے سہانے جھونکے دوپہر کو لُو کی جھُلستی ہوئی لپٹ۔ شاخیں پھولوں سے لدیں۔ پھر وہ دن آیا۔ جب نہ دن کو چین تھا نہ رات کو نیند۔ دن تڑپتا تھا۔ رات جلتی تھی۔ ندیاں قسائیوں کے دلوں کی طرح سوکھ گئیں جنگل کے جانور۔ دوپہر کی دھوپ میں پیاس سے زبان نکالے

اِدھر اُدھر پانی کی تلاش میں دوڑتے پھرتے تھے۔ جس طرح
کینہ سے بھرے ہوئے دل ذرا ذرا سی باتوں پر جل اُٹھتے
ہیں۔ اسی طرح گرمی سے تپتے ہوئے جنگل کے درخت کبھی
کبھی ہوا کے جھونکوں سے باہم رگڑ کھا کر جل اُٹھتے تھے۔ شعلے
بلند ہوتے۔ گویا اگن راج نے تاروں پر حملہ کیا ہے۔ جنگل میں
میں ایک بھگدڑ سی ہو جاتی۔ پھر آندھی اور طوفان کے دن آئے
ہوا کی دیبی گرجتی ہوئی آتی۔ زمین اور آسمان تھرتھرا اُٹھتے
سورج چھپ جاتا۔ پہاڑ بھی کانپ اُٹھتے تھے۔ پھر برسات کا
جنم ہوا۔ مینہ کی جھڑی لگی۔ جنگل لہرائے۔ ندیوں نے پھر اپنا راگ
چھیڑا۔ پہاڑوں کے کلیجے ٹھنڈے ہوئے۔ سوکھے ہوئے میدانوں
میں ہریالی چھائی۔ سارس کی صدائیں پہاڑوں میں گونجنے لگیں
اساڑھ میں بچپن کا الڑپن تھا۔ ساون میں شباب کے
پینگ بڑھے۔ پھواریں پڑنے لگیں۔ بھادوں کمائی کے دن
تھے۔ جس نے جھیلوں کے خزانے بھر دیئے۔ پہاڑوں کو غنی
بنا دیا۔ آخر بڑھاپا آیا۔ کانس کے سفید بال لہرانے لگے۔ جاڑا
آ پہنچا۔

(۱۴)

اسی طرح رُتیں بدلیں - دن اور مہینے گزرے - سال آئے۔ اور گئے - مگر دوجی نے وندھیا کے اُس گوشۂ دامن کو نہ چھوڑا۔ گرمیوں کے بھیانک دن - اور برسات کی ڈراؤنی راتیں - سب اُسی جگہ کاٹ دیں - کیا کھاتی تھی - کیا پہنتی تھی - اس کا ذکر فضول ہے - دل پر چاہے جو گزرے - شکم کے تقاضے اور موسمی تکلیفیں نہیں مانتیں - قدرت کی نھال سجی ہوئی تھی - کبھی جنگلی بیروں کے پکوان تھے - کبھی شریفوں کے - کبھی تیندو - کبھی مکوء اور کبھی رام کا نام کپڑوں کے لئے وہ سال میں ایک بار چترکوٹ کے میلے میں جاتی - موروں کے پر اور ہرن کے سینگ اور جنگلی بوٹیاں مہنگے داموں بکتیں - کپڑا بھی آیا - ضروری برتن بھی ہوئے یہاں تک کہ چراغ بتی جیسے تکلفات کے سامان بھی ہو گئے - ایک چھوٹی سی گرہستی جم گئی ؛

مگر دوجی نے وحشتناک مایوسی کے عالم میں دنیا سے مُنہ موڑ کر رہنا جتنا آسان سمجھا تھا - اُس سے بہت زیادہ مشکل نظر آیا - روحانیت کے سرور میں ڈوبا ہوا ویراگی تو جنگل میں رہ سکتا ہے - مگر ایک عورت جس کی زندگی ہنسنے کھیلنے میں گزری ہو

کسی ڈونگے کے سہارے کے بغیر ویراگ کا اتھاہ سمندر کیونکر پار کر سکتی ہے۔ دو سال کے بعد دوجی کو وہاں ایک ایک دن کاٹنا دو بھر ہو گیا۔ گھر کی سُدھ اُسے ایک دم کو نہ بھولتی۔ کبھی کبھی اس کا جی ایسا بیچین ہوتا۔ کہ ذرا دیر کے لئے رسوائی کا خوف بھی دور ہو جاتا۔ وہ مستقل ارادہ کر کے اُن پہاڑیوں کے درمیان تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی گھر کی طرف چلتی۔ گویا کوئی قیدی جیلخانہ سے بھاگا جا رہا ہے۔ مگر پہاڑیوں کے حلقہ سے باہر آتے ہی آپ اُس کے قدم رُک جاتے۔ وہ آگے نہ بڑھ سکتی۔ تب وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ایک چٹان پر بیٹھ جاتی۔ اور خوب پھوٹ پھوٹ روتی۔ پھر وہی ڈراؤنی رات اور وہی کنج قفس۔ وہی ندی کا نالۂ غم۔ اور وہی گیدڑوں کی منحوس صدائیں!

جوں جوں کملی بھیگتی ہے۔ زیادہ بھاری ہوتی ہے۔ قسمت کو کوستے کوستے اُس نے پیارے للن سنگھ کو کوسنا شروع کیا۔ قید تنہائی نے اُس میں توجیہہ اور استدلال کی صلاحیت پیدا کی۔ میں کیوں اس ویرانے میں منہ چھپائے مصیبت کے دن کاٹ رہی ہوں؟ یہ سب اسی ظالم للن سنگھ کی لگائی

ہوئی آگ ہے۔ کیسے آرام سے رہتی تھی ۔ اسی نے آکر میرے
جھونپڑے میں آگ لگادی۔ میں نادان بے سمجھ تھی۔ اس نے
جان بوجھ کر میری مٹی خراب کی۔ اُس نے مجھے صرف اپنے دل
بہلاؤ کا ایک کھلونا بنایا۔ اگر اُسے مجھ سے محبت ہوتی۔ تو کیا
وہ مجھ سے شادی نہ کر سکتا تھا۔ وہ بھی تو چندیل تھا۔ آہ! میں
کیسی بے سمجھ تھی۔ اپنے پیروں میں آپ کلہاڑی ماری ۔

اس طرح دل سے باتیں کرتے کرتے جب للن سنگھ کی صورت
اُس کے پردہ نگاہ کے سامنے آکر کھڑی ہوتی ۔ تو وہ نفرت سے
منہ پھیر لیتی۔ وہ شوخ مسکراہٹ جو اس کا من ہر لیا کرتی تھی۔
وہ محبت میں ڈوبی ہوئی سرگوشیاں جو اس کی رگوں میں سنسناہٹ
پیدا کر دیتی تھیں۔ وہ رمز وکنائے جن پر وہ متوالی ہو جاتی تھی ۔
اب اسے ایک دوسرے ہی روپ میں نظر آتے ۔ اُن میں
اب خلوص یا محبت کی جھلک نہ تھی ۔ وہ اب فریب اور نفس
پرستی اور ہوس رانی کے گاڑھے رنگ میں رنگے ہوئے تھے
وہ پریم کا کچا گروندہ جس میں وہ گڑیا بنی بیٹھی تھی ۔ ہوا کے
جھونکے میں سنبھلا۔ مگر پانی کی ویر اژدھار میں نہ سنبھل سکا۔ اب
وہ بدنصیب گڑیا بیرحم چٹانوں پر ٹپک دی گئی ہے ۔ کہ رو رو

کر زندگی کے دن کاٹے ۔ اُن گڑیوں کی طرح جو گوٹے پٹھے اور گھنوں سے سجی ہوئی مخملی پٹارے میں ناز برداریوں کا لطف اُٹھانے کے بعد پھر ندی اور تالاب میں بہادی جاتی ہیں۔ ڈوبنے کے لئے اور لہروں میں تھپیڑے کھانے کے لئے ۔

للن سنگھ کی طرف سے پھرتے ہی دوجی کا دل ایک بیتابانہ جوش کے ساتھ بھائیوں کی طرف مڑا ۔ میں اپنے ساتھ اُن بیچاروں کو ناحق لے ڈوبی ۔ میرے سر پر اس گھڑی نہ جانے کونسا بھوت سوار تھا ۔ ان بیچاروں نے تو جو کچھ کیا میری ہی آبرو رکھنے کے لئے کیا ۔ میں تو اندھی ہو رہی تھی ۔ سمجھانے بجھانے سے کیا کام چلتا ۔ اور سمجھانا بجھانا تو عورتوں کا کام ہے ۔ مردوں کا سمجھانا تو اسی ڈھنگ کا ہوتا ہے ۔ اور ایسا ہی ہونا چاہئے ۔ نہیں معلوم ان بیچاروں پر کیا بیتی ۔ کیا میں پھر کبھی اُنہیں دیکھوں گی ۔ یہ سوچتے سوچتے بھائیوں کی وہ صورت اُس کی آنکھوں میں پھر جاتی ۔ جو اُس نے آخری بار دیکھی تھی ۔ جب وہ اُس دیس کو جا رہے تھے ۔ جہاں سے لوٹ کر آنا گویا موت کے منہ سے نکل آنا ہے ۔ وہ سُرخ آنکھیں ۔ وہ غرور سے بھری ہوئی چال ۔ بھائیوں کی وہ غلط

انداز نگاہیں جو ایکبار اُس کی طرف اُٹھ گئی تھیں۔ آہ! ان میں اب عفو تقصیر کے معنی یاد آتے تھے۔ اُن میں غصّہ یا انتقام نہ تھا۔ صرف چھا تھی۔ وہ مجھ پر غصّہ کیا کرتے۔ پھر عدالت کے اجلاس کا نقشہ نظروں کے سامنے آجاتا۔ بھائیوں کے وہ تیور۔ ان کی وہ آنکھیں جو صرف ایک لمحہ کے لئے غصّہ کی گرمی سے پھیل گئی تھیں۔ پھر اُن کی پیار کی باتیں۔ ان کی دلجوئیاں یاد آتیں۔ پھر وہ دن یاد آتے۔ جب وہ اُن کی گود میں کھیلتی تھی۔ جب وہ انگلی پکڑ کر کھیتوں کو جایا کرتی تھی۔ آہ! کیا وہ دن بھی آئیں گے۔ کہ میں اُنہیں پھر دیکھوں گی؟

ایک دن وہ تھا۔ کہ دوجی اپنے بھائیوں کے خون کی پیاسی تھی۔ آخر ایک دن آیا۔ کہ وہ پسونی ندی کے کنارے سنگریزوں سے دنوں کا شمار کرتی تھی۔ ایک بخیل جس احتیاط سے روپیوں کو گن گن کر جمع کرتا ہے۔ اسی احتیاط سے دوجی اِن سنگریزوں کو گن گن کر جمع کرتی تھی۔ ہر روز شام کے وقت وہ اس ڈھیر میں پتھر کا ایک ٹکڑا اور رکھ دیتی۔ تو ذرا دیر کے لئے اُسے روحانی مسرت حاصل ہوتی۔ یہ سنگریزوں کا ڈھیر اب اُس کا مایۂ زندگانی تھا۔ دن میں کتنی بار وہ اِن ٹکڑوں

کو دیکھتی اور گنتی۔ بیکس چڑیا پتھر کے ڈھیلوں سے اُمید کے گھونسلے بناتی تھی ؛

اگر کسی کو حسرت اور کاہش غم کی زندہ تصویر دیکھنا ہو تو وہ پسونی ندی کے کنارے ہر روز شام کے وقت دکھائی دیتی ہے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کی طرح اُس کا چہرہ زرد ہے۔ وہ اپنے غمناک خیالات میں ڈوبی ہوئی محویت کے ساتھ لہروں کی طرف نظر جمائے بیٹھی رہتی ہے۔ یہ لہریں اتنی تیزی سے کہاں جا رہی ہیں؟ مجھے بھی اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتیں۔ کیا میرے لئے وہاں بھی جگہ نہیں ہے؟ شاید نالۂ غم میں یہ بھی میری ہمنوا ہیں۔ لہروں کی طرف دیکھتے دیکھتے اسے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ٹھیر گئی ہیں۔ اور ہیں تیزی سے بڑھی جا رہی ہوں۔ تب وہ چونک پڑتی ہے۔ اور اندھیرے چٹانوں کے درمیان راستہ ٹٹولتی ہوئی پھر اپنے گوشۂ الم میں آ کر پڑ رہتی ہے ؛

اسی طرح دوجی نے اپنے ایام مصیبت کاٹے۔ تین نیس ڈھیلوں کے بارہ ڈھیر تیار ہوئے۔ تب اُس نے انہیں یکجا جمع کر دیا۔ شب غم کی پہلی گھڑی کٹی۔ دس سال تک وہ

سجدہ گاہ اُمید بنتی رہی۔ اُس جانبازانہ ارادت کے ساتھ جو کسی
بھگت کو اپنے معبود سے ہوتی ہے۔ رات کے دس گھنٹے بیت
گئے۔ مشرق کی طرف تنویرِ صبح نظر آنے لگی۔ وعدۂ وصل قریب
آیا۔ آتشِ شوق تیز تر ہوئی۔ دوجی ان ڈھیروں کو بار بار گنتی۔
مہینوں کے دن شمار کرتی۔ شاید ایک دن بھی کم ہو جائے۔ آہ!
آج کل اُس کے دل کی وہ کیفیت تھی۔ جو صبح کے وقت سورج
کی سنہری روشنی میں ہلکورے لینے والے ساگر کی ہوتی ہے۔
جس میں ہوا کی لہروں سے مسکراتا ہُوا کنول جھومتا ہے۔

(۱۵)

آج دوجی ان پہاڑوں اور جنگلوں سے بدا ہوتی ہے۔ وہ
دن آپہنچا۔ جس کی راہ دیکھتے دیکھتے ایک پورا جُگ بیت گیا۔
آج چودہ سال کے بعد اُس کی پیاسی زلفیں ندی میں لہرا رہی
ہیں۔ برگد کی جٹائیں ناگن بن گئی ہیں۔

اس ویرانے سے اُس کی طبیعت کتنی بیزار تھی۔ لیکن
آج اس سے جُدا ہوتے ہوئے دوجی کی آنکھیں بھر بھر آتی ہیں
جس پاکر کے سایہ میں اُس نے مصیبت کے دن جھیلے۔
جس غار کی گود میں اُس نے رو رو کر راتیں کاٹیں۔ اُنہیں

چھوڑتے اُسے آج رنج ہوتا ہے۔ یہ مصیبت کے ساتھی ہیں۔

سورج کی کرنیں دوجی کی اُمیدوں کی طرح کھُرے کی گھٹاؤں کو ہٹاتی چلی آتی تھیں۔ اس نے اپنی مصیبت کے رفیقوں کو پُرنم نگاہوں سے دیکھا۔ پھر اُن تودوں کے پاس گئی۔ جو اُس کی دوازدہ سالہ ریاضت کے یادگار تھے۔ اُس نے ایک ایک کرکے اُنہیں چوما۔ گویا وہ دیوی کے چبوترے ہیں۔ اور تب روتی ہوئی چلی۔ جیسے لڑکی سُسرال کو چلتی ہے۔

شام کو وہ شہر میں داخل ہوئی۔ اور پتہ لگاتے ہوئے کیلاشی کے مکان پر آئی۔ مکان ویران پڑا ہُوا تھا۔ کیلاشی کی یادگار باقی تھی۔ تب وہ کرشن سنہ بکھیلا کے مکان کا پتہ پوچھتی ہوئی ان کے بنگلہ پر آئی۔ کنور صاحب چہل قدمی کرکے آئے ہی تھے۔ کہ اُسے کھڑے دیکھا۔ قریب آئے۔ چہرہ پر گھونگھٹ تھا۔ دوجی نے کہا۔ مہاراج! میں ایک بیکس عورت ہوں۔ کنور صاحب نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔ ارے! تم ہو دوجی! تم اتنے برسوں کہاں رہیں؟

کنور صاحب کے ہمدردانہ لہجہ نے دوجی کے گھونگھٹ اور بھی بڑھا دیئے۔ اُنہیں میرا نام یاد ہے۔ یہ سوچ کر اُس

کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ حیا سے گردن جھک گئی۔ لجاتی ہوئی بولی۔ بات میں بیکسانہ التجا کے بجائے اعتماد تھا۔ جس کا کوئی نہ ہو۔ اُسے جنگل کے سوا اور کہاں ٹھکانہ ہے۔ میں بھی جنگلوں میں رہی۔ پسونی ندی کے کنارے ایک گپھا میں پڑی رہی ؁

کنور صاحب کو سکتہ سا ہو گیا۔ چودہ سال! اور ایک گپھا میں ندی کے کنارے! کیا کوئی سنیاسی اس سے زیادہ تیاگ کر سکتا ہے۔ وہ حیرت سے کچھ نہ بول سکے ؁

دوجی انہیں خاموش دیکھ کر پھر بولی۔ میں کیلاشی کے مکان سے سیدھی پہاڑوں میں چلی گئی۔ اور وہیں اتنے دن کاٹے۔ چودہ سال پورے ہو گئے۔ جن بھائیوں کی گردن پر میں نے چھری چلائی۔ اُن کے چھوٹنے کے دن اب آئے ہیں۔ نارائن انہیں کشل سے لائے۔ میں چاہتی ہوں۔ کہ اُن کے درشن کروں۔ اور اُن کی طرف سے میرے دل میں جو ارمان ہے۔ وہ پورا ہو جائے۔ کنور بنے سنگھ بولے۔ تمہارا حساب بہت ٹھیک ہے۔ میرے پاس آج کلکتہ سے سرکاری خط آیا ہے۔ کہ دونوں بھائی ۱۴ تاریخ کو کلکتہ پہنچیں گے۔ اُن کے وارثوں کو اطلاع دی جائے۔ یہاں غالباً وہ لوگ دو تین

دن میں آجائیں گے - میں سوچ ہی رہا تھا - کہ اطلاع کس
کو دوں *

دوجی نے آرزومندانہ لہجہ میں کہا - میرا جی چاہتا ہے -
کہ وہ جہاز پر سے اُتریں تو میں اُن کے پاؤں پر سر رکھوں -
اُس کے بعد مجھے دنیا میں اَور کوئی ارمان باقی نہ رہے گا - اسی
لالسا نے مجھے اتنے دنوں تک ٹھوکریں کھلائی ہیں - ورنہ میں
آپ کے سامنے کھڑی نہ ہوتی *

کنور بنے سنگھ نے فلسفیانہ مزاج پایا تھا - دوجی کے دل
کی کیفیتیں اور نیرنگیاں اُن کے دل پر گہرا نقش کرتی جاتی تھیں
جب ساری عدالت دوجی پر ہنستی تھی - تب انہیں اُس کے
ساتھ ہمدردی تھی - اور آج اُس کے حالات سُن کر وہ اس
دہقانی عورت کے معتقد ہو گئے - اتنے ہی جتنا وہ کسی زندہ
انسان کے ہو سکتے تھے - ارادتمندانہ انداز سے بولے - اگر
تمہاری یہ خواہش ہے - تو میں خود تمہیں کلکتہ پہنچا دوں گا - تم
نے اُن سے ملنے کی جو صورت سوچی ہے - اُس سے بہتر
خیال میں نہیں آ سکتی - مگر تم کھڑی ہو - اور میں بیٹھا ہوا
ہوں - یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا - دوجی میں بناوٹ نہیں

کرتا جس میں اتنا تیاگ اور اتنا مضبوط ارادہ ہو۔ وہ اگر مرد ہے۔ تو دیوتا ہے۔ عورت ہے تو دیوی ہے۔ جب میں نے تمہیں پہلے دیکھا اُسی وقت میں نے سمجھ لیا تھا۔ کہ تم معمولی عورت نہیں ہو۔ جب تم کیلاشی کے مکان سے چلی گئیں۔ تو سب لوگ یہی کہتے تھے۔ کہ تم جان پر کھیل گئیں۔ مگر میرا دل کہتا تھا۔ کہ تم زندہ ہو۔ آنکھوں سے دور رہ کر بھی تم میرے خیال سے باہر نہ ہو سکیں۔ میں نے برسوں تمہاری تلاش کی۔ مگر تم ایسے کھڈ میں جا چھپی تھیں۔ کہ تمہارا کچھ پتہ نہ چلا۔

ان باتوں میں کتنا خلوص۔ کتنی ثقاہت آمیز محبت تھی۔ مگر دوجی کے بدن میں رعشہ سا آگیا۔ دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ اُس وقت اُس کا جی چاہتا تھا۔ کہ میں ان کے پیروں پر سر رکھ دوں۔ کیلاشی نے ایکبار جو بات اس سے کہی تھی۔ اور جسے سُن کر اُس نے وہاں سے بھاگنے ہی میں اپنی خیریت سوچی تھی۔ وہ بات اس وقت اُسے یاد آئی۔ اُس نے بھولے پن سے پوچھا۔ کیا آپ ہی کے کہنے سے کیلاشی نے مجھے اپنے گھر رکھا تھا؟

کنور صاحب نادم ہوکر بولے۔ میں اس کا کچھ جواب نہ

دوں گا۔

رات کو جب کیلاشی ایک برہمنی کے گھر میں نرم بچھونے پر لیٹی ہوئی تھی۔ تو اُس کے دل کی وہ کیفیت ہو رہی تھی۔ جو کنوار کے مہینہ میں آسمان کی ہوتی ہے۔ ایک طرف روشن چاند۔ دوسری طرف گھنی گھٹا۔ اور تیسری طرف جھلملاتے ہوئے تارے۔

(۱۶)

صبح کا وقت تھا۔ گنگا نامی سٹیمر خلیج بنگال کے سطح زرین پر غرور سے گردن اُٹھائے سمندر کی لہروں کو پیروں سے روندتا ہوا ہُگلی کے بندرگاہ کی طرف چلا آتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار سے زیادہ مسافر اُس کے آغوش عافیت میں تھے۔ بیشتر نفع تجارت کے خواہش مند۔ کچھ علمی تحقیق کے دلدادہ۔ کچھ سیر و تفریح کے متوالے۔ اور کچھ ایسے ہندوستانی مزدور جنہیں اپنے وطن کا شوق دیدار کھینچے لئے آتا تھا۔ انہیں میں دونو بھائی شان سنگھ اور گمان سنگھ ایک گوشے میں بیٹھے حسرتناک نگاہوں سے ساحل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دونو ہڈیوں کے دو ڈھانچے۔ خستہ حال۔ انہیں پہچاننا مشکل تھا۔

جہاز گھاٹ پر پہنچا۔ مسافروں کے عزیز و اقارب اور احباب ساحل پر اُن کا خیر مقدم کرنے کے لئے شوق سے بیتاب ہو رہے تھے۔ جہاز پر سے اُترتے ہی رسم وفا اور آداب محبت کا سیلاب سا اُمڈا۔ دوست ہاتھ ملاتے تھے۔ عزیز سینوں سے چمٹتے تھے۔ اور آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے تر ہو رہی تھیں یہ دونوں بھائی آہستہ آہستہ جہاز پر سے اُترے۔ گویا کسی نے دھکیل کر اُتار دیا۔ اُن کے لئے جہاز کے تختے اور وطن کی سر زمین میں کوئی فرق نہ تھا۔ آئے نہیں۔ بلکہ لائے گئے۔ ایک مدت دراز کے جور و جبر اور فکر و غم نے ان میں زندگی کا احساس تک نہ باقی رکھا تھا۔ ہمتیں بجھی ہوئی۔ آرزوئیں کب کی مر چکی تھیں۔ وہ ساحل پر کھڑے نگاہ وحشت سے سامنے تاکتے تھے۔ کہاں جائیں اُن کے لئے اس وسیع دنیا میں کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔

تب دوجی اُس بھیڑ میں سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس نے بھائیوں کو کھڑے دیکھا۔ تب جس طرح پانی نشیب کی طرف گرتا ہے۔ اُسی طرح دوجی بیتابانہ جوش کے ساتھ روتی ہوئی اُن کے پیروں سے چمٹ گئی۔ داہنے ہاتھ میں شان سنگھ کے پیر تھے۔ بائیں ہاتھ میں گمان سنگھ کے اور آنکھوں سے آنسو

جاری تھے۔ گویا دو سوکھے درختوں کی جڑیں ایک مرجھائی ہوئی بیل چمٹی ہوئی ہے۔ یا دو فقیر بابا اور موہ کی زنجیر میں بندھے کھڑے ہیں۔ بھائیوں کی آنکھیں بھی اُمڈیں۔ اُن کے چہرے بادل میں سے نکلنے والے تاروں کی طرح روشن ہوگئے۔ وہ دونوں زمین پر بیٹھ گئے۔ اور تینوں بھائی بہن ایک دوسرے سے گلے مل کے خوب بلک بلک کر روئے۔ وہ گہری کھاڑی جو بہن اور بھائیوں کے درمیاں حائل تھی۔ آنسوؤں سے لبریز ہوگئی۔ آج چودہ سال کے بعد بھائی اور بہن میں ملاپ ہوا۔ اور وہ زخم جس نے گوشت کو گوشت۔ اور خون کو خون سے جُدا کر دیا تھا۔ بھر گیا تھا۔ اور یہ اس مرہم کا کام تھا۔ جس سے زیادہ شفا بخش کوئی دوسرا مرہم نہیں ہے۔ جو دل کی کدورتوں کو صاف کرتا جسم کے بدنما داغ اور دھبوں کو مٹا دیتا ہے۔ جو درد غم کو بھلانے والا۔ اور دل کی جلن کو ٹھنڈا کرنے والا ہے۔ جو طعنہ کے زہریلے زخموں کو بھی مندمل کر دیتا ہے۔ یہ مرہم ایّام ہے ✣

(۱۷)

دونوں بھائی وطن کو لوٹے۔ پٹی داروں کے خواب پریشان ہوگئے۔ عزیز و اقربا جمع ہوئے۔ برہم بھوج کی ٹھہری۔ کڑھاؤ

چڑھ گئے - پوریاں پکنے لگیں - گھی کی موٹے معزز برہمنوں کے لئے - تیل کی غریب پاسی چماروں کے لئے - کالے پانی کا پاپ اس گھی کے ساتھ بھسم ہو گیا +

دوجی بھی کلکتہ سے بھائیوں کے ساتھ چلی - الہ آباد تک آئی - کنور بنے سنگھ بھی اُن کے ساتھ تھے - بھائیوں سے کنور صاحب نے دوجی کے متعلق کچھ باتیں کیں - اُن کی بھنک دوجی کے کان میں پڑی - الہ آباد میں دونوں بھائی بہن ٹھہر گئے کہ پریاگ راج میں اشنان کرتے چلیں - کنور بنے کرشن اپنے خیال میں سب کچھ ٹھیک کر کے وبخوش کن امیدوں کا خواب دیکھتے ہوئے روانہ ہو گئے - مگر وہاں سے پھر دوجی کا کچھ پتہ نہ چلا - معلوم نہیں کیا ہوئی - کہاں چلی گئی - شاید گنگا نے اسے اپنی گود میں لے کر ہمیشہ کی کوفت سے چھڑا دیا - بھائی روئے پیٹے - مگر کیا کرتے - جس جگہ دوجی نے اپنے بن باس کے چودہ سال کاٹے تھے - وہاں دونوں بھائی ہر سال جاتے ہیں - اور ان پتھروں کے تودوں سے چمٹ چمٹ کر روتے ہیں +

کنور صاحب نے بھی پنشن لی - اب چترکوٹ میں رہتے

ہیں۔ فلسفیانہ مزاج کے آدمی تھے۔ جس محبت کی تلاش تھی وہ نہ ملی۔ ایکبار کچھ اُمید نظر آئی تھی۔ جو چودہ سال تک ایک خیال کی صورت میں قائم رہی۔ دفعتہً اُمید کی دھندلی جھلک بھی ایکبار ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی طرح ہنس کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔ مگر اس سچے جذبات والی۔ بھولی عورت کی تصویر کبھی آنکھوں سے نہیں اُتری۔

اماوس کی رات

اماوس کی رات

(۱)

دیوالی کی شام تھی۔ سری نگر کے گھوروں اور کھنڈروں کے بھی نصیب جاگ گئے تھے۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں ہنستے کھیلتے چمکتی ہوئی تھالیوں میں چراغ لئے ہوئے مندروں کو جاتے تھے۔ چراغوں سے زیادہ اُن کے چہرے روشن تھے ہر در و دیوار روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ صرف پنڈت دیودت کا ہفت منزلہ محل تاریکی میں کالی گھٹا کی طرح خاموش اور خوفناک کھڑا تھا۔ خاموش اس لئے کہ ایّام رفتہ کی یاد سے دل بھرا ہوا تھا۔ اور خوفناک اس لئے کہ جگمگاہٹ گویا اُسے چڑھا رہی تھی + ایک زمانہ وہ تھا۔ کہ حسد بھی اسے دیکھ دیکھ کر ہاتھ ملتا تھا۔ اور ایک زمانہ یہ ہے۔ کہ خفارت بھی اس پر مُسکراتی

ہے۔ دروازے پر وردی پوش دربانوں کے بجائے اب مدار اور ارنڈ کے درخت کھڑے تھے۔ دیوان خانہ میں اب ایک عاشق تن ساں ڈانیٹ اکڑتا تھا۔ اور بالاخانوں پر ماہرویوں کے نغمۂ دلاویز کے بجائے۔ اب جنگلی کبوتروں کی مستانہ آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کسی انگریزی مدرسے کے طالب علم کے اخلاق کی طرح اس کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ اور اس کی دیواریں کسی بیوہ کے جگر کی طرح چاک تھیں۔ بیداد زمانہ کا شکوہ کرنا فضول ہے۔ یہ کج فہمی اور کم اندیشی کی عبرتناک داستان تھی۔

اماوس کی رات تھی۔ روشنی سے مقابلے کی تاب نہ لاکر تاریکی نے اسی عالی شان محل میں پناہ لی تھی۔ پنڈت دیودت اپنے نیم تاریک کمرے میں خاموش اور متفکر بیٹھے ہوئے تھے۔ آج ایک مہینے سے اُن کی بیوی گرجا کی زندگی بیرحم موت کا کھلونا بنی ہوئی تھی۔ وہ غربت اور افلاس کی مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے تیار تھے۔ فلسفۂ تقدیر اُنہیں تشفی دیتا تھا۔ لیکن یہ نئی مصیبت قوت برداشت سے باہر تھی۔ بیچارے دن کے دن گرجا کے سرہانے بیٹھے اُس کے مرجھائے ہوئے چہرہ کو

دیکھ دیکھ کر کُڑھتے اور روتے تھے۔ گر جا جب اپنی زندگی سے مایوس ہو کر روتی۔ تو وہ اُسے سمجھاتے "گرجا نہ رو۔ تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی"۔

پنڈت دیودت کے بزرگوں کا کاروبار بہت فروغ پر تھا۔ وہ لین دین کیا کرتے تھے۔ اور زیادہ تر اُن کے بیوہار بڑے بڑے تعلقہ داروں اور راجاؤں کے ساتھ تھے۔ اس زمانہ میں ایمان اتنا ارزاں نہیں بکتا تھا۔ سادے رقعوں اور پرزوں پر لاکھوں کی باتیں ہو جاتیں۔ مگر ۵۷ء کی شورش نے کتنے ہی علاقوں اور ریاستوں کو مٹا دیا۔ اور ان کے ساتھ تیواریوں کا یہ متمول گھرانہ بھی خاک میں مل گیا۔ اثاثہ لُٹ گیا۔ بہی کھاتے پنساریوں کے کام آئے۔ جب ذرا امن و امان ہُوا۔ ریاستیں پھر سنبھلیں۔ تو زمانہ پلٹ چکا تھا۔ قول تحریر کا محتاج ہو چکا تھا۔ اور تحریریں سادہ اور رنگین کی تمیز پیدا ہو گئی تھی۔ جب دیودت نے ہوش سنبھالا۔ تو اس کے پاس ایک کھنڈر کے سوا اور کوئی جائداد نہ تھی۔ اب گزران کی صورت مفقود تھی۔ کاشتکاری میں محنت اور پریشانی تھی۔ تجارت کے لئے نہ سرمایہ تھا۔ نہ دماغ۔ علمی استعداد اتنی نہ تھی۔ کہ کوئی

ملازمت کرتے۔ خاندانی وقار خیرات لینے میں ہارج تھا۔ بس سال میں دو تین بار اپنے بیوہاریوں کے یہاں بن بلائے مہمان کی طرح جاتے۔ اور جو کچھ رخصتانہ اور زاد راہ ملتا۔ اسی پر گزران کرتے۔ خاندانی حشمت کی یادگار کچھ باقی تھی۔ تو وہ ان رقعوں اور ہنڈیوں کا ایک پلندہ تھا۔ جن کی سیاہی بھی حرف باطل کی طرح مٹ چکی تھی۔ پنڈت دیودت انہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ دوج کے دن جب گھر گھر لکشمی کی پوجا ہوتی ہے۔ پنڈت جی اس پلندے کی بہت اہتمام کے ساتھ پرستش کرتے۔ لکشمی نہ سہی لکشمی کی یادگار تو تھی۔ دوج کا دن اُن کی ثروت کے شرادھ کا دن تھا۔ اسے چاہے بوالہوسی کہو۔ چاہے کمزوری۔ مگر پنڈت ممدوح کو اُن پرزوں پر بڑا ناز تھا۔ آئے دن کی مناقشات میں اس بوسیدہ کاغذی فوج کی حمایت بڑا کام کرتی۔ اور فریق مخالف کو اپنی ہار ماننی پڑتی۔ اگر ستّر پشتوں سے ہتھیار کی صورت نہ دیکھنے پر لوگ چھتری ہونے کا فخر کر سکتے ہیں۔ تو پنڈت دیودت کا اُن نوشتوں پر فخر کرنا زیادہ بے موقع نہیں معلوم ہوتا۔ جن میں ستّر لاکھ کی رقم چھپی ہوئی تھی +

(۲)

وہی اماوس کی رات تھی۔ مگر چراغ اپنی مختصر زندگیاں ختم کر چکے تھے۔ اور رات کی تاریکی سے زیادہ اخلاقی تاریکی کا غلبہ تھا۔ چوروں اور جواریوں کے لئے یہ شگون کی رات تھی۔ کیوں کہ آج کی ہار سال بھر کی ہار ہوتی ہے۔ لکشمی کی آمد آمد تھی۔ اس لئے اُن کا پیش خیمہ آ گیا تھا۔ جا بجا کوڑیوں پر اشرفیاں لٹ رہی تھیں۔ پیرِ مُغاں بھی آج نخرے کر رہا تھا میخانے میں شراب کے بدلے پانی بک رہا تھا۔ پنڈت دیودت کے سوا قصبہ میں کوئی ایسا شخص نہ تھا۔ جو دوسروں کی کمائی سمیٹنے کی فکر میں نہ ہو۔ آج صبح ہی سے گرجا کی حالت خراب تھی۔ اور سرِ شام سے اُس پر غشی طاری تھی۔ یکایک اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اور بہت مدھم آواز سے بولی "آج تو دیوالی ہے"۔

دیودت ایسا بیدل اور نراس ہو رہا تھا۔ کہ گرجا کو ہوش میں بھی دیکھ کر اُسے خوشی نہ ہوئی "ہاں آج دیوالی ہے" گرجا نے آرزو مند نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "ہمارے گھر میں دیئے نہ جلیں گے"؟

دیودت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ گرجا نے پھر اُسی لہجہ میں کہا۔ "دیکھو آج برس برس کے دن گھر اندھیرا رہ گیا۔ مجھے اُٹھا دو۔ مَیں بھی اپنے گھر میں دیئے جلاؤں گی"۔

یہ باتیں دیودت کے دل میں چبھی جاتی تھیں۔ انسان کے آخری لمحے خوشیوں اور آرزوؤں کے خیال میں کٹتے ہیں۔ گرجا موت کے منہ میں تھی۔ مگر آرزوؤں کا خواب دیکھ رہی تھی۔

اس قصبہ میں لالہ شنکر داس مشہور وید تھے۔ ضلع کی آیورویدک سوسائٹی کی روح رواں۔ اوشدھالے میں ادویہ کے بجائے چھاپنے کے پریس رکھے ہوئے تھے۔ دوائیں کم بنتی تھیں۔ مگر اشتہار زیادہ چھپتے تھے۔ چرک اور سشرت پر قانع نہ ہو کر انہوں نے نئے طبّی اصولوں کی تلقین شروع کی تھی۔ تندرستی انسان کا طبعی حق ہے۔ بیماری صرف ایک رئیسانہ تکلّف ہے۔ اور پولیٹیکل اکانومی کے مسئلہ کے مطابق تکلفات سے جس قدر زیادہ ممکن ہو ٹیکس لینا چاہئے۔ اسی اصول پر وہ مریضوں کے ساتھ مطلق رورعایت نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی غریب ہو تو ہو۔ اگر کوئی مرتا ہے۔ تو مرے۔ اسے کیا حق ہے۔ کہ وہ بیمار پڑے۔ اور مفت میں علاج کرالے۔

ہندوستان کی یہ حالت بہت کچھ مفت علاج کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اس نے آدمیوں کو بے احتیاط اور کمزور بنا دیا ہے۔ دیودت مہینہ بھر سے روز اُن کے یہاں دوا لینے آیا کرتا تھا لیکن ویدجی کبھی ایسی ہمدردی سے مخاطب نہ ہوئے۔ کہ اسے عرض حال کا صلہ ہوتا۔ اُن کے دل کے کمزور حصے تک پہنچنے کے لئے اُس نے بہت ہاتھ پیر چلائے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے آتا۔ مگر دیوجی کا دل مضبوط تھا۔ اس میں کمزور حصہ تھا ہی نہیں ÷

وہی اماوس کی ڈراؤنی رات تھی۔ آسمانی شمعیں آدھی رات گزرنے پر اب اور بھی زیادہ روشن ہو گئی تھیں۔ گویا وہ سری نگر کے بجھے ہوئے چراغوں پر فاتحانہ مسرت کے ساتھ مُسکرا رہی تھیں۔ دیودت ایک عالم اضطراب میں گرجا کے سرہانے سے اُٹھے۔ اور ویدجی کے مکان کی طرف چلے۔ وہ جانتے تھے۔ کہ لالہ اتنی رات گئے بلا اپنا حق خدمت لئے ہرگز نہ آئیں گے۔ لیکن مایوسی میں بھی اُمید پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دیودت قدم آگے بڑھاتا چلا جاتا تھا ÷

(۴)

حکیم جی اس وقت اپنی مجرب تیر بہدف" امرت بندو کا اشتہار لکھنے میں محو تھے۔ اور اس اشتہار کی پُرتاثیر عبارت۔ مصورانہ رنگینی۔ اور پرزور کشش کے اعتبار سے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا۔ کہ وہ حکیم حاذق تھے۔ یا ناثرِ جادو طراز۔

ناظرین! آپ جانتے ہیں۔ کہ میں کون ہوں؟ آپ کا زرد چہرہ۔ آپ کا تن لاغر۔ آپ کا ذرا سی محنت میں بیدم ہو جانا۔ آپ کا لذّات دنیا سے بے فیض رہنا۔ آپ کی خانہ تاریکی۔ یہ سب اس سوال کا نفی میں جواب دیتے ہیں۔ سنئے میں کون ہوں۔ میں وہ شخص ہوں۔ جس نے امراض انسانی کو پردہ دنیا سے معدوم کر دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ جس نے اشتہار باز جو فروش گندم نما۔ نام نہاد حکیموں کو بیخ و بُن سے کھود کر دنیا کو پاک کر دینے کا عزم بالجزم کر لیا ہے۔ میں وہ حیرت انگیز انسان ضعیف البنیان ہوں۔ جو ناشاد کو دلشاد۔ نامُراد کو بامُراد بھگوڑے کو دلیر۔ گیدڑ کو شیر بناتا ہوں۔ اور یہ کسی جادو سے نہیں۔ منتر سے نہیں۔ یہ میری ایجاد کردہ "امرت بندو" کے ادنےٰ کرشمے ہیں۔ امرت بندو کیا ہے۔ اسے پُچھ

میں ہی جانتا ہوں - مہرشی اگست نے دھنونتری کے کان میں اس کا نسخہ بتلایا تھا - جس وقت آپ وی - پی پارسل کھولیں گے - آپ پر اُس کی حقیقت روشن ہو جائے گی - وہ آب حیات ہے - وہ مردانگی کا جوہر - فرزانگی کی اکسیر - عقل کا منبع - اور ذہن کا صیقل ہے - اگر برسوں کی شعر بازی نے بھی آپ کو شاعر نہیں بنایا - اگر شبانہ روز کی رٹنت پر بھی آپ امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکے - اگر دلّالوں کی خوشامد اور موکلوں کی نازبرداری کے باوجود آپ احاطۂ عدالت میں بھوکے کتّے کی طرح چکّر لگاتے پھرتے ہیں - اگر آپ گلا پھاڑ پھاڑ چیخنے - اور میز پر ہاتھ پیر ٹپکنے پر بھی اپنی تقریر میں کوئی اثر نہیں پیدا کر سکتے - تو آپ امرت بندو کا استعمال کیجیے - اس کا سب سے بڑا فائدہ جو پہلے ہی دن معلوم ہو جائے گا - یہ ہوگا کہ آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی - اور آپ پھر کبھی اشتہار باز حکیموں کے دام فریب میں نہ پھنسیں گے -"

ویدجی اس اشتہار کو ختم کر کے اُسے باآواز بلند پڑھ رہے تھے - ان کی آنکھوں میں غرور جائز اور آنے والی کامیابی کی اُمید جھلک رہی تھی - کہ اتنے میں دیو دت نے باہر سے

آواز دی۔ ویدجی بہت خوش ہوئے۔ رات کے وقت اُن کی فیس دوگنی تھی۔ لالٹین لئے ہوئے باہر نکلے۔ تو دیوودت روتا ہُوا اُن کے پیروں سے لپٹ گیا۔ اور بولا "ویدجی! اس وقت مجھ پر رحم کیجئے۔ گرجا اب کوئی دم کی مہمان ہے۔ اب آپ ہی اُسے بچا سکتے ہیں۔ یوں تو میرے نصیب میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ہوکر رہے گا۔ مگر اس وقت آپ چل کر ذرا اُسے دیکھ لیں۔ تو میرے آنسو پچھ جائیں گے۔ مجھے تسکین ہو جائے گی۔ کہ اس کی خاطر مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا۔ وہ میں نے کیا۔ ایشور جانتا ہے۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔ کہ آپ کی کچھ خدمت کر سکوں۔ لیکن جب تک جیوں گا آپ کا جس گاؤں گا۔ اور آپ کے اشاروں کا غلام بنا رہوں گا"۔

حکیم جی کو پہلے تو ترس آیا۔ مگر یہ جگنو کی چمک تھی۔ جو بہت جلد خود غرضی کی تاریک وسعت میں غائب ہو گئی۔

(۴)

وہی اماوس کی رات تھی۔ پھڑوں پر بھی سناٹا چھا گیا۔ جیتنے والے اپنے بچوں کو نیند سے جگا جگا کر انعام دے رہے تھے۔ ہارنے والے اپنی ناہمدرد اور پُرغضب بیویوں سے عذر گناہ

کرتے تھے۔ کہ اتنے میں گھنٹوں کی گونجتی ہوئی پیہم آوازیں۔ ہوا اور تاریکی کو چیرتی ہوئی کان میں آنے لگیں۔ ان کا مستانہ انداز اس عالم خموشی میں بہت ہی سُہانا معلوم ہوتا تھا۔ یہ آوازیں قریب ہوتی گئیں۔ اور بالآخر پنڈت دیودت کے مکان کے پاس آکر اُس کی وسعت پریشان میں غائب ہوگئیں۔ پنڈت جی اس وقت یاس کے بحر بے پایاں میں غوطے کھا رہے تھے۔ افسوس! میں اس قابل بھی نہیں۔ کہ اپنی جان سے عزیز گرجا کی دوا درپن کر سکوں۔ کیا کروں! اس بیدرد حکیم کو یہاں کیسے لاؤں۔ ظالم! میں ساری عمر تیری غلامی کرتا۔ تیرے اشتہار چھاپتا۔ تیری دوائیں کوٹتا۔ آج پنڈت جی کو یہ ناگوار اور ہمت شکن تجربہ ہُوا۔ کہ ستر لاکھ کے رقعے اور کاغذ اتنی کوڑیوں کے مول بھی نہیں۔ خاندانی وقار کا سُراب آنکھوں کے سامنے سے دور ہوگیا۔ اُنھوں نے اس مخملی جزدان کو صندوق سے باہر نکالا۔ اور ان رقعات کو جو خاندانی ثروت کے باقیات صالح تھے۔ اور جن کی عزت کی طرح نگہداشت کی جاتی تھی۔ ایک ایک کر کے چراغ کی نذر کرنے لگے۔ جس طرح ناز و نعمت میں پلا ہُوا جسم چتا کی بھینٹ ہو جاتا ہے اسی طرح یہ کاغذی ہستیاں اس شمع کے دہن آتشیں کا لقمہ

ہوتی جاتی تھیں۔ اتنے میں کسی نے باہر سے پنڈت جی کو پکارا۔ انہوں نے چونک کر سر اٹھایا خواب سے بیدار ہوئے اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے دروازہ پر آئے۔ تو دیکھا۔ کہ کئی آدمی مشعلیں لئے ہوئے کھڑے ہیں۔ اور ایک ہاتھی اپنی سونڈ سے اُن ارنڈ کے درختوں کو اکھاڑ رہا ہے۔ جو دروازے پر دربانوں کی طرح کھڑے تھے۔ ہاتھی پر ایک شکیل نوجوان بیٹھا ہوا ہے۔ جس کے سر پر زعفرانی رنگ کی ریشمی پاگ ہے۔ ماتھے پر چندن کا ہلالی ٹیکہ بھالے کی طرح تنی ہوئی نوکدار مونچھیں۔ چہرہ سے رعب اور جلال نمایاں۔ کوئی سردار معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کلی دار انگرکھا۔ اور چناو دار پائجامہ۔ کمر میں لٹکتی ہوئی تلوار۔ اور گردن میں طلائی کنٹھے اور زنجیر اُس کے مردانہ جسم پر بہت زیب دے رہے تھے پنڈت جی کو دیکھتے ہی اُس نے رکاب پر پاؤں رکھا۔ اور نیچے اُتر کر ان کی تعظیم کی۔ اس کے مؤدبانہ اخلاق سے کچھ نادم ہو کر پنڈت جی بولے۔ آپ کا آنا کہاں سے ہوا؟

نوجوان نے بہت منت آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ اُس کے بشرہ سے شرافت برستی تھی۔ میں آپ کا پرانا خادم ہوں۔ غریب خانہ راج نگر میں ہے۔ وہاں کا جاگیردار ہوں۔ میرے بزرگوں پر آپ

کے خاندان نے بہت احسان کئے ہیں۔ میری اس وقت جو کچھ
عزت اور جاہ ہے۔ وہ سب آپ کے بزرگوں کی شفقت اور کرم کا
طفیل ہے۔ میں نے اپنے چند رشتہ داروں سے آپ کا نام سنا تھا
اور مجھے عرصے سے آپ کے درشنوں کی آرزو تھی۔ آج وہ مبارک
موقع مل گیا۔ اور میرا جنم سپھل ہوا۔

پنڈت دیودت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ خاندانی حشمت
کا غرور اُن کے دل کا نازک ترین حصہ تھا۔ وہ بے بسی جو اُن کے
چہرہ پر چھائی ہوئی تھی۔ ذرا دیر کے لئے رخصت ہو گئی۔ فاخرانہ
انداز سے بولے "یہ آپ کی بندہ نوازی ہے۔ جو ایسا فرماتے ہیں۔
ورنہ میں تو ننگ خاندان ہوں۔ اس قابل بھی نہیں۔ کہ اپنے آپ
کو اُن بزرگوں کی اولاد کہہ سکوں۔" اتنے میں خادموں نے صحن
میں فرش بچھا دیا۔ دونوں آدمی اُس پر بیٹھے۔ اور باتیں ہونے
لگیں۔ وہ باتیں جن کا ہر جملہ پنڈت دیودت کے چہرہ کو اس طرح
شگفتہ کر رہا تھا۔ جس طرح نسیم سحر پھولوں کو کھلا دیتی ہے۔ پنڈت
جی کے جد بزرگوار نے نوجوان ٹھاکر کے دادا کو پچیس ہزار روپے
قرض دیئے تھے۔ ٹھاکر اب گیا میں جا کر اپنے بزرگوں کا شراد
کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے ضروری تھا۔ کہ اُن کے ذمہ جو کچھ قرض

ہو اس کی ایک ایک کوڑی ادا کر دی جائے۔ ٹھاکر کو پرانے کاغذات میں یہ واجب الادا رقم نظر آئی۔ پچیس کے اب پچھتر ہزار ہو چکے تھے۔ وہی قرض چکانے کے لئے ٹھاکر دو سو میل کی منزل طے کر کے آیا تھا۔ مذہب ہی وہ قوت ہے۔ جو دل میں ارادت کا جوش پیدا کر سکتی ہے۔ ہاں اس جوش سے متاثر ہونے کے لئے ایک پاکیزہ بے لوث دل کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہی ارادت سیہ کاری اور شقاوت پر اتر آتی ہے۔ آخر ٹھاکر نے پوچھا ”آپ کے یہاں تو وہ رقعہ ہوگا؟“

دیودت کا دل بیٹھ گیا۔ سنبھل کر بولے ”غالباً ہوگا۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔“

ٹھاکر نے بے پروائی سے کہا ”اسے تلاش کیجئے۔ اگر مل جائے تو میں اسے لیتا جاؤں گا۔“

پنڈت دیودت اٹھے۔ مگر دل سرد۔ کیا یہ تقدیر کی ستم ظریفیاں ہیں۔ جو یوں سبز باغ دکھا رہی ہیں۔ کون جانے وہ پرزہ جل کر خاک ہو گیا ہے۔ یہ بھی تو نہیں معلوم کہ وہ پہلے بھی تھا یا نہیں۔ لیکن نہ ملا۔ تو روپے کون دیتا ہے۔ افسوس! دودھ کا پیالہ سامنے آ کر ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ اے ایشور! وہ پرزہ

مل جائے۔ میں نے بہت دکھ اُٹھائے ہیں۔ اب مجھ پر دیا کرو۔ اس طرح امید وبیم کی حالت میں دیودت اندر گئے۔ اور چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں بچھے ہوئے نوشتوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ دفعتاً وہ اچھل پڑے۔ اور ایک اضطراری جوش بلکہ دیوانگی مسرت کے عالم میں دو تین بار کودے۔ تب دوڑ کر گرجا کو گلے سے لگایا۔ اور بولے۔ "پیاری۔ ایشور نے چاہا۔ تو اب تم بچ جاؤ گی"۔ اس مدہوشی میں اُنہیں مطلق نہ معلوم ہُوا۔ کہ گرجا اب وہاں نہیں ہے۔ صرف اُس کی لاش ہے۔ اُس نے رقعے کو اٹھا لیا۔ اور دہلیز تک ایسی تیزی سے آیا۔ گویا پاؤں میں پر لگ گئے ہیں۔ مگر یہاں اس نے اپنے آپ کو روکا۔ اور مسرت قلب کی اُمڈتی ہوئی لہروں کو روکتے ہوئے ٹھاکر سے بولا۔ یہ لیجئے۔ وہ رقعہ مل گیا۔ اتفاق کی بات ہے۔ ورنہ ستر لاکھ کے کاغذ دیمکوں کی خوراک بن گئے۔

غیر متوقع کامیابی اکثر بدگمانی کا باعث ہوتی ہے۔ جب ٹھاکر نے اُس رقعے کے لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ تو دیودت کو اندیشہ ہُوا۔ کہ کہیں وہ اُسے چاک نہ کر ڈالے۔ حالانکہ یہ اندیشہ بالکل بے معنے تھا۔ مگر انسان کمزوریوں کا پتلا ہے۔ ٹھاکر نے اس کے

سورِ ظلمن کو تاڑ لیا۔ ایک ترحم آمیز تبسم کے ساتھ اُس نے رقعہ کو لیا اور مشعل کی روشنی میں دیکھ کر بولا۔ اب مجھے کامل اطمینان ہو گیا یہ لیجئے آپ کی امانت آپ کی نذر ہے۔ دعا کیجئے کہ میرے بزرگوں کی مُکت ہو جائے"۔

یہ کہہ کر اُس نے اپنی کمر سے ایک خریطہ نکالا۔ اور اس میں سے ایک ایک ہزار کے پچھتر نوٹ نکال کر دیودت کو دے دیئے۔ پنڈت جی کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور نبض اچھلی پڑتی تھی۔ انہوں نے ادھر چوکنی نگاہوں سے دیکھا کہ کہیں کوئی غیر تو نہیں کھڑا ہے۔ اور تب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کو لے لیا۔ اظہار عالی ظرفی کی بے سود کوشش میں ان کاغذوں کو گنا بھی نہیں۔ صرف اُڑتی ہوئی نگاہ سے دیکھ کر انہیں سمیٹا اور جیب میں ڈال لیا۔

(۵)

وہی اماوس کی رات تھی۔ آسمانی شمعیں بھی دھندلی ہو چلی تھیں۔ اُن کی فنا حرارت وحیات کے دیوتا کے آمد کی خبر دے رہی تھی۔ ستارۂ صبح سفیدۂ نور کے ساتھ یہ بشارت دینے کے لئے نمودار ہو چکا تھا۔ مسلط نیلگوں سیاہی نئے رنگوں اور اثروں

کے مقابلہ ہیں۔ سرحدی افقوں سے وسطِ آسمان میں ہٹی جاتی تھی۔ افقِ مشرق فیروزہ بانا پہن چکا تھا۔ اور افقِ مغرب ہلکے اُودے رنگ کی طرف مائل تھا۔ پنڈت دیودت ٹھاکر کو رخصت کر کے گھر میں چلے۔ اُس وقت اُن کا دل فیاضی کی روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ خوش اعتقادی کی لہر اُٹھی ہوئی تھی۔ کوئی سائل اس وقت اُن کے دروازے سے بے فیض نہ جا سکتا۔ ست نارائن کی کتھا سننے کا۔ اور دھوم دھام کے ساتھ سننے کا فیصلہ ہو چکا۔ گرجا کے لئے گہنے اور کپڑے کے منصوبے بندھ چکے۔ اندر پہنچتے ہی انہوں نے سالگرام کے سامنے سچے دل سے سر جھکایا۔ اور تب باقیماندہ رقعوں کو سمیٹ کر بہ حفاظت تمام اسی مخملی جزدان میں رکھ دیا۔ اس لئے نہیں۔ کہ شاید ان مردوں میں سے پھر کوئی زندہ ہو۔ بلکہ معاش کی طرف سے بے فکر ہو کر اب وہ خاندانی شوکت و ثروت پر فخر کر سکتے تھے۔ وہ صابرانہ قناعت کے جوش میں مست تھے۔ بس اب مجھے زندگی میں مال و دولت کی ضرورت نہیں۔ ایشور نے مجھے اتنا دیا ہے۔ اس میں میری اور گرجا کی زندگی پہلے ہی کٹ چکی ہے۔ ان کے دل میں یہ خیال گدگدا رہا تھا۔ کہ جس وقت گرجا یہ خوشخبری سنے گی۔ اُس وقت ضرور اُٹھ

بیٹھے گی۔ فکر اور تکلیف نے اس کی یہ گت بنا دی ہے۔ جسے کبھی بھر پیٹ روٹی نصیب نہ ہوئی۔ جو یکسانہ قناعت اور مایوسانہ صبر کی دلفگاریوں سے کبھی آزاد نہ ہوئی۔ اس کی حالت اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ گرجا کے پاس گئے۔ اور اسے آہستہ سے ہلا کر کہا۔ "گرجا آنکھیں کھولو۔ دیکھو ایشور نے تمہاری بنتی سن لی۔ اور ہمارے اوپر دیا کی۔ کیسی طبیعت ہے؟"

مگر جب گرجا ذرا بھی نہ ہلی۔ تو انہوں نے چادر ہٹا دی۔ اور اس کے منہ کی طرف دیکھا۔ سینہ سے ایک جگر سوز آہ نکلی۔ اور سر تھام کر وہیں بیٹھ گئے۔ آنکھوں سے خون کے قطرے نکل آئے۔ آہ! کیا یہ دولت اتنی گراں قیمت پر ملی ہے! کیا ایشور کے دربار سے مجھے اس پیاری جان کی قیمت دی گئی ہے۔ ایشور تم خوب انصاف کرتے ہو۔ مجھے گرجا کی ضرورت ہے۔ روپیوں کی ضرورت نہیں۔ یہ سودا بہت گراں ہے!

(۶)

اماوس کی اندھیری رات گرجا کی تاریک زندگی کی طرح ختم ہو چکی تھی۔ کھیتوں میں ہل چلانے والے کسانوں کے گانے کی بلند اور سہانی آوازیں آ رہی تھیں۔ سردی سے کانپتے ہوئے

نیچے سورج دیوتا سے باہر نکلنے کی التجا کر رہے تھے۔ پنگھٹ پر گاؤں کی البیلی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ پانی بھرنے کے لئے نہیں۔ ہنسنے کے لئے۔ کوئی گھڑے کو کنوئیں میں ڈالے اپنی پوپلی ساس کی نقل کر رہی تھی۔ کوئی ستون سے چمٹی ہوئی اپنی سہیلی سے مسکرا مسکرا کر راز و نیاز کی باتیں کرتی تھی۔ بوڑھی عورتیں روتے ہوئے پوتوں کو گود میں لئے۔ اپنی بہوؤں کو کوس رہی تھیں۔ جو گھنٹہ بھر ہوئے اب تک کنوئیں سے نہیں لوٹی تھیں۔ مگر راج وید لالہ شنکر داس ابھی تک میٹھی نیند سو رہے تھے۔ کھانستے ہوئے نیچے۔ اور کراہتے ہوئے بوڑھے ان کے دواخانہ کے دروازہ پر جمع ہو چکے تھے۔ اس مجمع بے تمیزی سے کچھ دور ہٹ کر دو تین خوش وضع مگر زرد رو نوجوان سر جھکائے ٹہلتے نظر آتے تھے۔ اور ویدجی سے تخلیہ میں کچھ باتیں کرنے کی فکر میں تھے۔ اتنے میں پنڈت دیودت ننگے سر۔ ننگے بدن۔ سرخ آنکھیں۔ چہرہ سے وحشت برستی ہوئی۔ کاغذ کا ایک پلندہ لئے دوڑے ہوئے آئے۔ اور دواخانہ کے دروازہ پر اتنی زور سے ہانک لگائی۔ کہ ویدجی چونک پڑے۔ اور کہار کو آواز دی۔ کہ جا کر دروازہ کھول دے۔ یہ حضرت بڑی رات گئے کسی برادری کی پنچایت سے لوٹے تھے۔ انہیں

گرانخوابی کا مرض تھا۔ جو باوجود حکیم جی کے مسلسل زبانی اور طبی نسخوں کے۔ کم نہ ہوتا تھا۔ بارے آپ اینڈتے ہوئے اُٹھے۔ اور دروازہ کھول کر اپنے حقہ چلم کی فکر میں آگ ڈھونڈھنے چلے گئے۔ حکیم جی چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہ یکا یک دیودت اُن کے روبرو جا کر کھڑے ہو گئے۔ اور نوٹوں کا پلندا اُن کے آگے ٹپک کر بولے۔ ویدجی! یہ پچھتر ہزار کے نوٹ ہیں۔ یہ آپ کا شکرانہ اور آپ کی فیس ہے۔ آپ چل کر گرجا کو دیکھ لیجئے۔ اور ایسا کچھ کیجئے کہ وہ صرف یکبار آنکھیں کھولدے۔ یہ اس کی ایک نگاہ کا صدقہ ہے۔ صرف ایک نگاہ۔ آپ کو روپئے انسان کی جان سے پیارے ہیں۔ وہ آپ کی نذر ہیں۔ مجھے گرجا کی ایک نگاہ ان روپیوں سے کئی گنی پیاری ہے"۔

ویدجی نے ندامت آمیز ہمدردی سے دیودت کی طرف دیکھا۔ اور صرف اتنا کہا۔ مجھے افسوس ہے۔ میں ہمیشہ کے لئے تمہارا گنہگار ہوں۔ مگر تم نے مجھے سبق دے دیا۔ ایشور نے چاہا۔ تو اب ایسی غلطی نہ ہوگی۔ مجھے افسوس ہے۔ واقعی سخت افسوس ہے۔

یہ باتیں ویدجی کے دل سے نکلی تھیں۔

غیرت کی کٹار

(۱)

کتنا افسوس ناک - کتنا پُر درد سانحہ ہے - کہ وہی نازنین جو کبھی ہمارے گوشۂ جگر میں بستی تھی - اُسی کے گوشۂ جگر میں چبھنے کے لئے ہمارا خنجر آب دار بے قرار ہو رہا ہو - جس کی آنکھیں ہمارے لئے آب حیات کے چھلکتے ہوئے ساغر تھیں - وہی آنکھیں ہمارے دل میں شعلہ اور خون کا طوفان برپا کریں -
حُسن اسی وقت تک مایۂ راحت و شادمانی ہے - نعمت روحانی جب تک اُس کے قالب میں عصمت کی روح حرکت کر رہی ہو - ورنہ وہ مایۂ شر ہے - زہر اور عفونت سے لبریز - اسی قابل کہ وہ ہماری نگاہوں سے دور رہے - اور پنجہ و ناخن کا شکار بنے !
ایک زمانہ وہ تھا - کہ نعیمہ حیدر کی آرزوؤں کی دیوی تھی - طالب

مطلوب کی تمیز نہ تھی - ایک طرف کامل دلجوئی تھی - دوسری طرف کامل رضا - تب تقدیر نے پانسہ پلٹا - گل و بلبل میں نسیم کی غمازیاں شروع ہوئیں - شام کا وقت تھا - آسمان پر شفق کی دلفریب سرخی چھائی ہوئی تھی - نعیمہ اُمنگ اور فرحت اور شوق سے امڈی ہوئی - بالاخانہ پر آئی - اسی شفق کی طرح اس کا چہرہ بھی اُس وقت گلگوں ہو رہا تھا - عین اُسی وقت وہاں کا صوبہ دار ناصر اپنے بادرفتار گھوڑے پر سوار اُدھر سے نکلا - اوپر نگاہ اٹھی تو حسن صبیح کا کرشمہ نظر آیا - گویا چاند شفق کے حوض میں نہا کر نکلا ہے - تیر نگاہ جگر کے پار ہُوا - کلیجہ تھام کر رہ گیا - اپنے محل کو لوٹا - نیم جان اور خستہ - ہوا خواہوں نے طبیب کی تلاش کی اور تب راہ و رسم پیدا ہوئی - پھر تالیف اور تعشق کی دشوار منزلیں طے ہوئیں - وفا اور حیا نے بہت بے رخی دکھائی - مگر محبت کے شکوے اور عشق کی کفر شکن دھمکیاں آخر غالب آئیں عصمت کا خزانہ لٹ گیا - اس کے بعد وہی ہُوا جو ہو سکتا تھا - ایک طرف سے بدگمانی - دوسری طرف سے تصنع اور ریاکاری شکر رنجیوں کی نوبت آئی - پھر دل خراشیاں شروع ہوئیں - حتیٰ کہ دلوں میں میل پڑ گئی - ایک دوسرے کے خون کے

پیاسے ہو گئے - نعیمہ ناصر کی آغوش محبت میں پناہ گزیں ہوئی -
اور آج ایک مہینہ کی بیقراری اور انتظار کے بعد حیدر اپنے جذبات
کے ساتھ برہنہ شمشیر پہلو میں چھپائے اپنے جگر کے بھڑکتے ہوئے
شعلوں کو نعیمہ کے خون سے بجھانے کے لئے آیا ہوا ہے ؎

(۲)

آدھی رات کا وقت تھا - اور اندھیری رات تھی - جس
طرح حرم سرا سے فلک میں حسن کے ستارے جگمگا رہے تھے -
اسی طرح ناصر کی شبستان حرم بھی حسن کی شمعوں سے روشن تھی -
ناصر ایک ہفتہ سے کسی مہم پر گیا ہوا ہے - اس لئے دربان
غافل ہیں - انہوں نے حیدر کو دیکھا - مگر اُن کے منہ لقمہ تر سے
بند تھے - خواجہ سراؤں کی نگاہ پڑی - لیکن وہ پہلے ہی شرمندۂ
احسان ہو چکے تھے - خواصوں اور کنیزوں نے بھی پر معنی نگاہوں
سے اس کا استقبال کیا - اور حیدر انتقام کے نشہ میں گنہگار
نعیمہ کی خوابگاہ ناز میں جا پہنچا - جہاں کی ہوا صندل اور گلاب
سے معطر تھی ؎

کمرہ میں ایک مومی شمع روشن تھی - اور اس کی رازدارانہ
روشنی میں آرائش اور تکلف کی گلکاریاں نظر آتی تھیں - جو

عصمت جیسی بیش بہا جنس کے بدلے میں خریدی گئی تہیں۔ وہیں عشرت اور ملاحت کی گود میں لیٹی ہوئی نعیمہ مست خواب تھی۔

حیدر نے ایک بار نعیمہ کو آنکھ بھر دیکھا۔ وہی موہنی صورت تھی۔ وہی دلربایانہ ملاحت۔ اور وہی تمنا خیز شگفتگی۔ وہی نازنین جسے ایک بار دیکھ کر بھولنا غیر ممکن تھا۔

ہاں وہی نعیمہ تھی۔ وہی ساعد سیمیں جو کبھی اُس کے گلے کا ہار بنتے تھے۔ وہی موئے عنبریں جو کبھی اُس کے شانوں پر لہراتے تھے۔ وہی پھول سے رخسارے جو اس کی نگاہ شوق کے سامنے سُرخ ہو گئے تھے۔ انہیں گوری گوری کلائیوں میں اس نے نوشگفتہ کلیوں کے کنگن پہنائے تھے۔ اور جنہیں وہ وفا کے کنگن سمجھا تھا۔ اسی گلے میں اُس نے پھولوں کے ہار سجائے تھے۔ اور اُنہیں پریم کا ہار خیال کیا تھا۔ لیکن اُسے کیا معلوم تھا۔ کہ پھولوں کے ہار۔ اور کلیوں کے کنگن کے ساتھ وفا کے کنگن اور پریم کے ہار بھی مرجھا جائیں گے۔

ہاں یہ ہی گلاب کے سے ہونٹ ہیں۔ جو کبھی اس کی دلجوئیوں میں پھول کی طرح کھل جاتے تھے۔ جس سے اُلفت کی دلا دینے

مہک اُڑتی تھی - اور یہ وہی سینہ ہے - جس میں کبھی اُس کی محبت اور وفا کا جلوہ تھا - جو کبھی اُس کی محبت کا کاشانہ تھا ؂
مگر جس پھول میں دل کی مہک تھی - اُس میں دغا کے کانٹے ہیں ؂

(۳)

حیدر نے شمشیر آبدار پہلو سے نکالی - اور دبے پاؤں نعیمہ کی طرف آیا - لیکن اُس کے ہاتھ نہ اُٹھ سکے - جس کے ساتھ عمر بھر زندگی کی سیر کی - اُس کی گردن پر چھُری چلاتے ہوئے اُس پر رقت کا غلبہ ہُوا - اُس کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں - دل میں حسرتناک یادگاروں کا ایک طوفان سا آ گیا - کیا خوبی تقدیر ہے - کہ جس محبّت کا آغاز ایسا پُر مسرت ہو اُس کا انجام ایسا دلخراش ہو - اُس کے پیر تھرتھرانے لگے - لیکن غیرت نے للکارا - دیوار پر لٹکی ہوئی تصویریں اُس کی اس کمزوری پر مسکرائیں ؂
مگر کمزور ارادہ ہمیشہ سوال و دلیل کی آڑ لیا کرتا ہے - حیدر کے دل میں خیال پیدا ہُوا - کیا اس باغ محبت کے اُجاڑنے کا الزام میرے اوپر نہیں ہے؟ جس وقت بدگمانیوں کے اکھوے نکلے - اگر میں نے طعنہ اور نفرین کے بجائے دلداریوں سے کام

کیا ہوتا۔ تو آج یہ دن نہ آتا۔ میری ہی ستم شعاریوں نے محبت اور وفا کی جڑ کاٹی۔ عورت کمزور ہوتی ہے۔ کسی سہارے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جس عورت نے محبت کے مزے اُٹھائے ہوں۔ اور الفت کی ناز برداریاں دیکھی ہوں۔ وہ طعن اور تحقیر کی آنچ کیا سہ سکتی ہے۔ لیکن پھر غیرت نے اُکسایا۔ گویا وہ دھندلی شمع بھی اُس کی کمزوریوں پر ہنسنے لگی۔

غیرت اور استدلال میں سوال وجواب ہو رہے تھے۔ کہ دفعتاً نعیمہ نے کروٹ بدلی۔ اور انگڑائی لی۔ حیدر نے فوراً تلوار اُٹھائی۔ خطرۂ جان میں پس وپیش کہاں۔ دل نے فیصلہ کر لیا۔ تلوار اپنا کام کرنے والی ہی تھی۔ کہ نعیمہ نے آنکھیں کھول دیں۔ موت کی کٹار سر پر نظر آئی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ حیدر کو دیکھا۔ صورت حال سمجھ میں آگئی۔ بولی حیدر:۔

(۴)

حیدر نے اپنی خفت کو غصّہ کے پردے میں چھپا کر کہا۔ ہاں میں ہوں حیدر! نعیمہ سر جھکا کر حسرتناک انداز سے بولی۔ تمہارے ہاتھوں میں یہ چمکتی ہوئی تلوار دیکھ کر میرا کلیجہ تھر تھرا رہا ہے۔ تمہیں نے مجھے ناز برداریوں کا عادی بنا دیا ہے۔ ذرا دیر کے

لئے اس کٹار کو میری آنکھوں سے چھپا لو۔ میں جانتی ہوں۔ کہ تم میرے خون کے پیاسے ہو۔ لیکن مجھے نہ معلوم تھا۔ کہ تم اتنے بے رحم اور سنگدل ہو۔ میں نے تم سے دغا کی ہے۔ تمہاری خطا وار ہوں۔ لیکن حیدر یقین مانو۔ اگر مجھے چند آخری باتیں کہنے کا موقع نہ ملتا۔ تو شاید میری روح کو دوزخ میں بھی یہی آرزو رہتی۔ سزائے موت سے پہلے اپنے یگانوں سے آخری ملاقات کی اجازت ہوتی ہے۔ کیا تم میرے لئے اتنی رعایت کے بھی روادار نہ تھے۔ مانا۔ کہ اب تم میرے کوئی نہیں ہو۔ مگر کسی وقت تھے۔ اور تم چاہے اپنے دل میں سمجھتے ہو۔ کہ میں سب کچھ بھول گئی۔ لیکن میں اتنی محبت فراموش نہیں ہوں۔ اپنے ہی دل سے فیصلہ کرو۔ تم میری بیوفائیاں چاہے بھول جاؤ۔ لیکن میری محبت کی دل شکن یادگاریں نہیں مٹا سکتے۔ میری آخری باتیں سُن لو۔ اور اس ناپاک زندگی کا قضیہ پاک کرو۔ مَیں صاف صاف کہتی ہوں۔ اس آخری وقت میں کیوں ڈروں۔ میری جو کچھ درگت ہوئی ہے۔ اس کے ذمہ وار تم ہو۔ ناراض نہ ہو۔ اگر تمہارا خیال ہے۔ کہ میں یہاں پھولوں کی سیج پر سوتی ہوں تو وہ غلط ہے۔ میں نے عصمت کھو کر عصمت کی قدر جانی ہے

میں حسین ہوں ۔ نازک اندام ہوں ۔ دنیا کی نعمتیں میرے لئے
حاضر ہیں ۔ ناصر میری رضا کا غلام ہے ۔ لیکن میرے دل سے
یہ خیال کبھی دور نہیں ہوتا ۔ کہ وہ صرف میرے حُسن اور ادا کا بندہ
ہے ۔ میری عزت اُس کے دل میں کبھی ہو ہی نہیں سکتی ۔
کیا تم جانتے ہو ۔ کہ یہاں خواصوں اور دوسرے محلوں کے
پُرمعنی اشارے وکنائے میرے خون وجگر کو نہیں جلاتے ۔
اُف ایسں نے عصمت کھو کر عصمت کی قدر جانی ہے ۔ لیکن
میں کہہ چکی ہوں ۔ اور پھر کہتی ہوں ۔ کہ اس کے تم ذمہ وار ہو ۔
حیدر نے پہلو بدل کر پوچھا کیونکر ؟
نعیمہ نے اسی انداز سے جواب دیا ۔ تم نے مجھے بیوی بنا کر
نہیں معشوق بنا کر رکھا ۔ تم نے مجھے ناز برداریوں کا عادی بنایا ۔
لیکن فرض کا سبق نہیں پڑھایا ۔ تم نے کبھی نہ اپنی باتوں سے
نہ فعلوں سے ۔ مجھے یہ خیال کرنے کا موقع دیا ۔ کہ اس محبت
کی بنیاد فرض پر ہے ۔ تم نے مجھے ہمیشہ رعنائیوں اور مستیوں
کے طلسم میں پھنسا رکھا ۔ اور مجھے نفس کی وارفتگیوں کا غلام
بنا دیا ۔ جس کی کشتی پر اگر فرض کا ناخدا نہ ہو ۔ تو پھر اُسے دریا
میں ڈوب جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ۔ لیکن ان باتوں

سے کیا حاصل ۔ اب تو تمہاری غیرت کی کٹار میرے خون کی پیاسی ہے ۔ اور یہ سر تسلیم اُس کے سامنے خم ہے۔ ہاں میری ایک آخری تمنا ہے ۔ اگر تمہاری اجازت پاؤں تو کہوں ؟

یہ کہتے کہتے نعیمہ کی آنکھوں میں اشک کا سیلاب آگیا۔ اور حیدر کی غیرت اُس کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ غمگین انداز سے بولا۔ کیا کہتی ہو؟

نعیمہ نے کہا۔ اچھا اجازت دی ہے ۔ تو انکار نہ کرنا ۔ مجھے ایک بار پھر اُن اچھے دنوں کی یاد تازہ کر لینے دو۔ جب موت کی کٹار نہیں۔ محبت کے پیکان جگر کو چھیدا کرتے تھے ایک بار پھر مجھے اپنے آغوش الفت میں لے لو۔ میری آخری التجا ہے ۔ ایکبار پھر اپنے ہاتھوں کو میری گردن کی حمائل بنا دو۔ بھول جاؤ۔ کہ میں نے تمہارے ساتھ دغا کی ہے۔ بھول جاؤ کہ یہ جسم گندہ اور ناپاک ہے ۔ مجھے محبت سے گلے لگا لو۔ اور یہ مجھے دے دو۔ تمہارے ہاتھوں میں یہ زیب نہیں دیتی ۔ تمہارے ہاتھ میرے اوپر نہ اُٹھیں گے ۔ دیکھو کہ ایک کم زور عورت کس طرح غیرت کی کٹار کو اپنے جگر

ہیں رکھ لینی ہے ÷

یہ کہہ کر نعیمہ نے حیدر کے کمزور ہاتھوں سے وہ شمشیر آبدار چھین لی - اور اس کے سینے سے لپٹ گئی - حیدر جھجکا لیکن وہ صرف عارفانہ جھجک تھی - غیرت اور جذبۂ انتقام کی دیوار ٹوٹ گئی - دونوں ہم آغوش ہو گئے - اور دونوں کی آنکھیں اُمنڈ آئیں ÷

نعیمہ کے چہرہ پر ایک دلاویز جان بخش تبسم نظر آیا - اور متوالی آنکھوں میں مسرّت کی سرخی جھلکنے لگی - بولی - آج کیسا مبارک دن ہے - کہ دل کی سب آرزوئیں پوری ہوتی جاتی ہیں - لیکن یہ کمبخت آرزوئیں کبھی پوری نہیں ہوتیں - اس سینہ سے لپٹ کر اب مے الفت کے بغیر نہیں رہا جاتا - تم نے مجھے کتنی بار پریم کے پیالے پلائے ہیں - اُس شیشہ و ساغر کی یاد نہیں بھولتی - آج ایک بار پھر مۓ اُلفت کے دور چلنے دو - بادۂ مرگ سے پہلے الفت کی شراب پلا دو - ایک بار پھر میرے ہاتھوں سے پیالہ لے لو - میری طرف اُنہیں پیار کی نگاہوں سے دیکھ کر جو کبھی آنکھوں سے نہ اُترتی تھیں - پی جاؤ - مرتی ہوں - تو خوشی سے مروں ÷

نعیمہ نے اگر عصمت کھوکر عصمت کی قدر جانی تھی۔ تو حیدر نے بھی محبت کھوکر محبت کی قدر جانی تھی۔ اس پر اس وقت ایک مدہوشی کا عالم طاری تھا۔ ندامت اور التجا اور سر تسلیم یہ غصہ اور انتقام کے مہلک دشمن ہیں۔ اور ایک نازنین کے نازک ہاتھوں میں تو اُن کی کاٹ شمشیر آبدار کو مات کر دیتی ہے مَے ناب کے دور چلے۔ اور حیدر نے مستانہ بلانوشی کے ساتھ پیالے پر پیالے خالی کرنے شروع کئے۔ اُس کے جی میں بار بار آتا تھا۔ کہ نعیمہ کے پیروں پر سر رکھ دوں۔ اور اُس اُجڑے ہوئے آشیانے کو آباد کر۔ پھر سرور کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اور اپنے قول فعل پر اُسے اختیار نہ رہا۔ وہ رویا۔ گڑگڑایا۔ منتیں کیں۔ یہاں تک کہ اُن دغا کے پیالوں نے اُسے سرنگوں کر دیا۔

(۵)

حیدر کئی گھنٹے تک بے سُدھ پڑا رہا۔ وہ چونکا تو رات بہت کم باقی رہ گئی تھی۔ اس نے اُٹھنا چاہا۔ لیکن اُس کے ہاتھ پیر ریشم کی ڈوریوں سے مضبوط بندھے ہوئے تھے۔ اس نے بھوچک ہوکر اِدھر اُدھر دیکھا۔ نعیمہ اُس کے سامنے وہی

خنجر آبدار لئے کھڑی تھی۔ اس کے چہرہ پر ایک قاتلانہ تبسم کی سرخی تھی۔ فرضی معشوق کی سفاکی و خنجر بازی کے ترانے وہ بارہا گا چکا تھا۔ مگر اس وقت اُسے اس نظارہ سے شاعرانہ لطف اُٹھانے کا جیوٹ نہ تھا۔ خطرۂ جان نشہ کے لئے ترشی سے بھی زیادہ قاتل ہے۔ گھبرا کر بولا۔ نعیمہ؟

نعیمہ نے تیز لہجہ میں کہا۔ ہاں میں ہوں نعیمہ۔

حیدر غصّہ سے بولا۔ کیا پھر دغا کی وار کی؟

نعیمہ نے جواب دیا۔ جب وہ مرد جسے خدا نے شجاعت اور قوت اور حوصلہ دیا ہے۔ دغا کی وار کرتا ہے۔ تو اُسے مجھ سے یہ سوال کرنے کا کوئی حق نہیں۔ دغا اور فریب یہ عورتوں کے ہتھیار رہیں۔ کیونکہ عورت کمزور ہوتی ہے۔ لیکن تم کو معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ عورت کے نازک ہاتھوں میں ہتھیار کیسی کاٹ کرتے ہیں۔ یہ دیکھو یہ وہی شمشیر آبدار ہے۔ جسے تم غیرت کی کٹار کہتے تھے۔ اب یہ غیرت کی کٹار میرے جگر میں نہیں۔ تمہارے جگر میں چبھے گی۔ حیدر! انسان تھوڑا کھو کر بہت کچھ سیکھتا ہے۔ تم نے عزت و حرمت ننگ و ناموس سب کچھ کھو کر بھی کچھ نہ سیکھا۔ تم مرد تھے۔ ناصر تمہارا

رقیب تھا۔ تمہیں اس کے مقابلہ میں اپنی تلوار کے جوہر دکھانا تھا۔ لیکن تم نے نرالی روش اختیار کی۔ اور ایک بیکس عورت پر دغا کا وار کرنا چاہا۔ اور اب تم اُسی عورت کے سامنے بے دست و پا پڑے ہوئے ہو۔ تمہاری جان بالکل میری مٹھی میں ہے۔ میں ایک لمحہ میں اُسے مسل سکتی ہوں۔ اور اگر میں ایسا کروں۔ تو تمہیں میرا منّت گذار ہونا چاہئے۔ کیونکہ ایک مرد کے لئے غیرت کی موت بے غیرتی کی زندگی سے اچھی ہے۔ لیکن میں تمہارے اوپر رحم کروں گی۔ میں تمہارے ساتھ فیاضی کا برتاؤ کروں گی۔ کیونکہ تم غیرت کی موت کے مستحق نہیں ہو۔ جو غیرت چند میٹھی باتوں اور ایک پیالہ شراب کے ہاتھوں بک جائے۔ وہ اصلی غیرت نہیں ہے۔ حیدر۔ تم کتنے سادہ لوح ہو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ کہ جس عورت نے عصمت جیسی بے بہا جنس دے کر یہ عیش اور تکلف پایا ہے۔ وہ زندہ رہ کر ان نعمتوں کا سکھ لوٹنا چاہتی ہے۔ جب تم سب کچھ کھو کر زندگی سے بیزار نہیں ہو۔ تو میں سب کچھ پا کر کیوں موت کی خواہش کروں۔ اب رات بہت کم رہ گئی ہے۔ یہاں سے جان لے کر بھاگو۔

ورنہ میری شفاعت بھی تمہیں ناصر کے غصّہ کی آگ سے نہ بچا سکے گی۔ تمہاری یہ غیرت کی کٹار میرے قبضہ میں رہے گی۔ اور تمہیں یاد دلاتی رہے گی۔ کہ تم نے عزّت کے ساتھ غیرت بھی کھو دی ÷
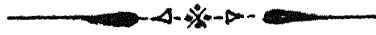
منزلِ مقصود

منزلِ مقصود

(۱)

آہ! آج تین سال گزر گئے۔ یہی مکان ہے۔ یہی باغ ہے۔ یہی گنگا کا کنارہ۔ یہی سنگ مرمر کا حوض۔ یہی میں ہوں اور یہی در و دیوار۔ مگر اب ان کیفیات سے دل متاثر نہیں ہوتا وہ نشہ جو گنگا کے لطف انگیز تلاطم اور ہوا کے دلفریب جھونکوں سے دل پر طاری ہو جاتا تھا۔ اُس کے لئے اب جی ترس ترس کے رہ جاتا ہے! اب وہ دل نہیں رہا۔ وہ نازنین جس پر زندگی کا مدار تھا۔ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

موہنی نے دلفریب صورت پائی تھی۔ اُس کے حُسن میں غضب کی تاثیر تھی۔ اُسے پیار کرنا مشکل تھا۔ وہ پرستش کرنے کے قابل تھی۔ اُس چہرے پر ہمیشہ ایک دل آویز روحانیت

کا جلوہ رہتا تھا۔ اُس کی آنکھیں جنہیں شرم کی متانت اور
پاکیزگی کا سرور تھا۔ محبت کا سرچشمہ تھیں۔ ایک ایک نگاہ۔
ایک ایک حرکت۔ ایک ایک بات اُس کے دل کی پاکیزگی
اور خلوص کا اثر دل پر پیدا کرتی تھی۔ جب وہ اپنی شرمگیں
نگاہوں سے میری طرف تاکتی تو اُس کی کشش اور اُس کی
گرمی میرے دل میں مدوجزر کا عالم پیدا کر دیتی تھی۔ اُس کی
آنکھوں سے روحانی جذبات کی شعاعیں نکلتی تھیں۔ مگر
اس کے لب کلمہ محبت سے ناآشنا تھے + اُس نے کبھی کنایۃً
بھی اس اتھاہ پریم کا اظہار نہیں کیا۔ جس کی لہروں میں وہ
خود پرکاہ کی طرح بہی جاتی تھی۔ اس کی محبت کی کوئی انتہا
نہ تھی۔ وہ محبت جس کی منزل وصال ہے۔ محبت نہیں نفس
پرستی ہے۔ موہنی کی وہ محبت تھی۔ جو وصال میں بھی ہجر کے
مزے لیتی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے۔ ایک بار جب اسی حوض
کے کنارے چاندنی رات میں میری گرمجوشیوں سے مخمور ہو کر
اُس نے کہا تھا۔ آہ! وہ آواز بھی دل پر نقش ہے"۔ وصال محبت
کا آغاز ہے۔ انجام نہیں" + مسائۂ اُلفت پر اس سے زیادہ
شاندار۔ اس سے زیادہ رفیع خیال کبھی میری نظر سے نہیں

گزرا۔ وہ محبت جو نگاہوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور مفارقت سے شاداب رہتی ہے۔ وہ ہوا کے ایک جھونکے کو بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ ممکن ہے۔ کہ یہ میری خودسرائی ہو۔ مگر وہ محبت جو میری کمزوریوں کے باوجود موہنی کو مجھ سے تھی۔ اُس کا ایک قطرہ بھی مجھے سرمست کرنے کے لئے کافی تھا+ میرے دل میں اتنی وسعت ہی نہ تھی۔ مجھے حیرت ہوتی تھی۔ کہ مجھ میں وہ کونسا وصف تھا۔ جس نے موہنی کو جذبۂ اُلفت سے بیخود کردیا تھا۔ جسامت۔ حُسن۔ اخلاق۔ جوہر مردانگی۔ یہی وہ اوصاف ہیں۔ جن پر محبت نثار ہوتی ہے۔ مگر میں ان میں سے ایک پر بھی ناز نہیں کرسکتا تھا۔ شاید یہ میری کمزوریاں ہی اُس سوز الفت کا باعث تھیں +

موہنی میں وہ ادائیں نہ تھیں۔ جن پر رنگیلی طبیعتیں فدا ہو جایا کرتی تھیں۔ ترچھی چتوں۔ نگاہ ناز۔ دلاویز تبسّم۔ زبان شوخ۔ ان کا یہاں وجود نہ تھا۔ مگر جس طرح چاند کی مدھم۔ خوشگوار روشنی میں کبھی کبھی پھواریں پڑنے لگتی ہیں۔ اُسی طرح عالم خلوص میں اُس کے چہرے پر ایک حسرتناک مسکراہٹ جلوہ افروز ہوتی اور آنکھیں آبگوں ہو جاتیں + یہ ادا نہ تھی۔ جذبات صادق کی

تصویر تھی - جو میرے دل میں پاکیزہ اُلفت کا ہیجان پیدا کر دیتی تھی!

(۲)

شام کا وقت تھا - دن اور رات باہم بغلگیر ہو رہے تھے آسمان پر متوالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں - اور میں موہنی کے ساتھ اسی حوض کے کنارے بیٹھا ہُوا تھا - روح افزا ہوائیں اور مخمور گھٹائیں گوشۂ دل میں سونے والے جذبۂ الفت کو بیدار کر دیا کرتی ہیں - وہ مدہوش سرمستی جو اُس وقت ہمارے دلوں پر چھائی ہوئی تھی - اُس پر میں ہزاروں بیداریوں کو قربان کر سکتا ہوں + ایسا معلوم ہوتا تھا - کہ اُس عالمِ بیخبری میں ہمارے دل بیتاب ہو کر آنکھوں سے ٹپک پڑیں گے + آج موہنی کی زبان بھی ضبط کی بیڑیوں سے آزاد ہو گئی تھی - اور اس کی جذبۂ لطیف میں ڈوبی ہوئی باتوں سے میری روح کو بالیدگی ہوتی تھی +

یکایک موہنی نے چونک کر گنگا کی طرف دیکھا - ہمارے دلوں کی طرح اُس وقت گنگا بھی اُمڈی ہوئی تھیں +

اس پرخروش اور ناہموار سطحِ آب پر ایک چراغ بہتا ہوا

چلا جاتا تھا۔ اور اُس کا عکس گلفشاں تھرکتا اور ناچتا ایک دُمدار ستارے کی طرح صفحۂ آب کو منور کر رہا تھا۔ آہ! اُس ہستی موہوم کی کیا بساط تھی۔ کاغذ کے چند پرزے۔ بانس کی چند تیلیاں۔ مٹی کا ایک دیا۔ گویا کسی نامراد کی آرزوؤں کی تربت تھی۔ جس پر کسی غمخوار نے ترس کھا کر ایک دیا جلا دیا تھا۔ مگر وہ ہستی بے وجود اُس اتھاہ ساگر میں اُچھلتی ہوئی لہروں سے ٹکراتی۔ گردابوں سے ہلکورے کھاتی۔ شور انگیز موجوں کو روندتی چلی جاتی تھی۔ شاید جل دیویوں نے اُس کی ضعیف ہستی پر ترس کھا کر اُسے اپنے آنچلوں میں چھپا لیا تھا!

جب تک وہ چراغ جھلملاتا اور ٹمٹماتا۔ ہمدرد لہروں سے جھکولے لیتا دکھائی دیا۔ موہنی ٹکٹکی لگائے ایک انداز محویت کے ساتھ اُس کی طرف تاکتی رہی۔ جب وہ دائرہ نظر سے دور نکل گیا۔ تو وہ ایک بیتابانہ جوش سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بولی۔
"میں کنارے پر جا کر اس چراغ کو دیکھوں گی"۔

جس طرح سے حلوائی کی صدائے خوش گوار سُن کر بچہ گھر سے باہر نکل پڑتا ہے۔ اور پُر اشتیاق نگاہوں سے دیکھتا۔ اور بے صبر آوازوں سے پکارتا اُس خوانِ نعمت کی طرف دوڑتا ہے

اُسی جوش اور اشتیاق کے ساتھ موہنی ندی کے کنارے چلی ؛

باغ سے ندی تک سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں - ہم دونو تیزی کے ساتھ نیچے اُترے - اور کنارے پہنچتے ہی موہنی نے فرطِ مسرت سے اُچھل کر زور سے کہا "ابھی ہے ! ابھی ہے ! دیکھو وہ نکل گیا" ؛

وہ معصومانہ جوش اور انتشار انگیز بے صبری جو موہنی کے چہرے پر اس وقت نمایاں تھی - مجھے کبھی نہ بھولے گی - میرے دل میں سوال پیدا ہوُا - اس چراغ سے اس قدر تعلق خاطر اس قدر وجد کیوں ؟ مجھ جیسا شاعرانہ حس سے عاری شخص اس معمے کو مطلق نہ سمجھ سکا ؛

میرے دل میں وسوسے پیدا ہوئے - اندھیری رات ہے گھٹائیں اُمڈی ہوئی - دریا طغیانی پر - ہوا تند - یہاں اس وقت ٹھہرنا مصلحت نہیں - مگر موہنی ! وہ پُرشوق بھولے پن کی تصویر - اُسی چراغ کی طرف آنکھیں لگائے خاموش کھڑی تھی - اور وہ چراغ ناشاد جوں کا توں ہلتا - مچلتا چلا جاتا تھا - نہ جانے کہاں ! کس دیس کو ؟

مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ چراغ پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا

موہنی نے حسرتناک لہجے میں پوچھا۔ کیا بجھ گیا ہوگا؟

اور قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دوں۔ وہ اُس کشتی کے قریب چلی گئی۔ جس پر ہم بیٹھ کر کبھی کبھی دریا کی سیر کیا کرتے تھے۔ اور پیار سے میرے گلے لپٹ کر بولی۔ مَیں اس چراغ کو دیکھنے جاؤں گی۔ میں دیکھوں گی۔ کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کس دیس کو!

یہ کہتے کہتے موہنی نے کشتی کی رسی کھول لی۔ جس طرح درختوں کی ڈالیاں طوفان کے جھونکوں سے جھکولے کھاتی ہیں۔ اسی طرح اُس وقت یہ کشتی ڈانواں ڈول ہو رہی تھی + دریا کی وہ مہیب وسعت موجوں کی وہ ڈراؤنی چھلانگیں۔ پانی کی وہ پُرشورش صدا۔ اس ہولناک تاریکی میں اس کشتی کا بیڑا کیونکر پار ہوگا! میرا دل بیٹھ گیا۔ کیا اس نامراد کی تلاش میں یہ کشتی بھی ڈوبے گی۔ مگر موہنی کا دل اُس وقت اُس کے بس میں نہ تھا۔ اسی چراغ کی طرح اُس کا دل بھی جذبات کے وسیع۔ متلاطم۔ پرشور دریا میں بہا جا رہا تھا۔

ہم کشتی میں بیٹھ گئے۔ اور کشتی لہروں پر جھولے کی طرح جھولتی چلی۔ آہ! کیسا ہولناک منظر تھا۔ متوالی گھٹائیں جُھکتی چلی آتی تھیں۔ گویا دریا سے گلے ملیں گی۔ اور وہ دریا سے سیاہ دیوالیں اٹھتا تھا۔ گویا بادلوں کو چھولے گا۔ دہشت سے آنکھیں مندی جاتی

تھیں۔ ہم تیزی کے ساتھ اُچھلتے۔ کراروں کے گرنے کی آوازیں سنتے۔ سیاہ درختوں کا جھومنا دیکھتے چلے جاتے تھے۔ آبادی پیچھے چھوٹ گئی۔ دیوتاؤں کی بستی سے بھی آگے نکل گئے۔ یکایک موہنی چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بولی۔ ابھی ہے! ابھی ہے! دیکھو بہا جا رہا ہے۔ میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ وہ چراغ جوں کا توں ہلتا مچلتا چلا جاتا تھا۔

(۳)

اُس چراغ کو دیکھتے ہم بہت دور نکل گئے۔ موہنی نے یہ راگ الاپنا شروع کیا:۔ (میں ساجن سے ملن چلی)

کیسا دلسوز نغمہ تھا! اور کیسی پُر درد رسیلی آواز۔ جذبہ اور رقت میں ڈوبے ہوئے۔ نغمہ دلکش میں تخیلات کو بیدار کرنے کی زبردست قوت ہوتی ہے۔ وہ انسان کو عالم موجودات سے اُٹھا کر عالم خیال میں پہنچا دیتا ہے۔ میری نگاہ خیال میں اُس وقت ندی کی پرشور لہریں۔ لب ساحل کی جھومتی ہوئی ڈالیاں۔ سنسناتی ہوئی ہوا سب متشکل نظر آتی تھیں۔ اور سب کی سب تیزی سے قدم اُٹھائے چلی جاتی تھیں۔ اپنے ساجن سے ملنے کے لئے اشتیاق اور اُلفت سے جھومتی ہوئی ایک نازنین کی دھندلی۔ خوابی تصویر

ہوا ہیں۔ لہروں میں۔ درختوں کے جھرمٹ میں محوخرام نظر آتی تھی اور وہ جاتی تھی۔ ساجن سے ملنے کے لئے! اس نغمے نے سارے پر اشتیاق کا جادو پھونک دیا۔

میں ساجن سے ملن چلی

ساجن بست کونسی نگری۔ میں بوری ناجانوں نا مجھے آس ملن کی اُس سے۔
ایسی پریت بھلی میں ساجن سے ملن چلی

موہنی خاموش ہوئی۔ تو چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور اُس سناٹے میں ایک بہت مدھم۔ رسیلی۔ خواب انگیز آواز افق کے اس پار سے۔ باد ریا کے نیچے سے یا ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آتی ہوئی گوش خیال میں سنائی دیتی تھی۔

میں ساجن سے ملن چلی

میں اس نغمے سے اس قدر متاثر ہوا۔ کہ ذرا دیر کے لئے مجھے خیال نہ رہا۔ کہ کہاں ہوں۔ اور کہاں جا رہا ہوں۔ دل و دماغ میں وہی راگ گونج رہا تھا۔ دفعتاً موہنی نے کہا۔ اُس چراغ کو دیکھو۔

میں نے چراغ کی طرف دیکھا۔ اُس کی روشنی ماند ہوگئی تھی۔ اور مایۂ زندگی ختم ہو چلا تھا۔ آخر وہ ایک دفعہ ذرا بھبکا اور گل ہوگیا۔

جس طرح پانی کی بوند دریا میں گر کر غائب ہو جاتی ہے ۔ اسی طرح تاریکی کی وسعت میں اُس چراغ کی ہستی غائب ہو گئی ۔ موہنی نے آہستہ سے کہا " اب نہیں دکھائی دیتا ۔ بجھ گیا "!

یہ کہہ کر اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ۔ جذبات درد اُمڈ آئے رقت سے گلا پھنس گیا ۔ زبان سے صرف اتنا نکلا " کیا یہی اس کی منزل مقصود تھی "؟ اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے ۔

میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا ۔ موہنی کی بیچینی اور اشتیاق بے صبری اور افسردگی کا راز سمجھ میں آ گیا ۔ اور بے اختیار میری آنکھوں سے بھی آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے ۔ کیا اُس پُرشور ۔ پُرخطر ۔ طوفانی سفر کی یہی منزل مقصود تھی !

(۴)

دوسرے دن موہنی اٹھی ۔ تو اُس کا چہرہ زرد تھا ۔ اُسے رات بھر نیند نہیں آئی تھی ۔ وہ طبعاً شاعرانہ جذبات کی عورت تھی ۔ رات کے اس واقعہ نے اس کی دردمند ۔ ذکی الحس طبیعت پر بہت اثر پیدا کیا تھا ۔ ہنسی اس کے ہونٹوں پر یونہی بہت کم آتی تھی ۔ ہاں چہرہ شگفتہ رہتا تھا ۔ آج سے وہ شگفتگی بھی رخصت ہوئی ۔ ہر دم چہرے پر ایک حسرت سی چھائی رہتی ۔ اور باتیں جگر

خراش - رقت آمیز ہوتی تھیں - میں اُس کے دل کو ان خیالات سے دور رکھنے کے لئے کئی بار ظرافت آمیز قصے لایا - مگر اُنہیں اس نے کھول کر بھی نہ دیکھا - ہاں جب میں گھر پر نہ ہوتا - تو وہ شاعری کی تصنیفیں دیکھا کرتی - مگر اس لئے نہیں - کہ اس کے پڑھنے سے کوئی لطف حاصل ہوتا تھا - بلکہ اس لئے کہ اُسے رونے کے لئے کوئی خیال مل جاتا تھا - اور وہ اشعار جو اس زمانے میں اس نے کہے - سوز و گداز کے نغمے ہیں - کون ایسا بشر ہے - جو انہیں پڑھ کر اپنے آنسو روک لے گا + وہ کبھی کبھی اپنے اشعار مجھے سُناتی - اور جب میں لذّت درد سے وجد میں آ کر داد دیتا - تو مجھے اُس کی روحانی مسرت کا نشہ نظر آتا تھا - ظرافت اور رنگینی ممکن ہے - بعض طبیعتوں پر اثر نہ پیدا کر سکے - مگر وہ کونسا دل ہے - جو سوز کے جذبات سے پگھل نہ جائے گا +

ایک روز ہم دونو اسی باغ کی سیر کر رہے تھے - شام کا وقت تھا - اور چیت کا مہینہ - موہنی کی طبیعت آج شگفتہ تھی - بہت دنوں کے بعد آج اُس کے لبوں پر مُسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی تھی + جب شام ہو گئی - اور پور نماشی کا چاند گنگا کی گود سے نکل کر اُوپر اُٹھا - تو ہم اُسی حوض کے کنارے بیٹھ گئے - یہ مولسریوں کی

قطار اور یہ حوض موہنی کی یادگاریں ہیں۔ چاندنی میں بساط آئی۔ اور چوپڑ ہونے لگی۔ آج طبیعت کی فرحت نے اُس کے حسن صبیح کو چمکا دیا تھا۔ اور اُس کی دلآویز شرارتیں مجھے مخمور کئے دیتی تھیں۔ میں کئی بازیاں کھیلا۔ اور ہر بار ہارا۔ ہارنے میں جو لطف تھا۔ وہ جیتنے میں کہاں۔ سرخوش رہنے میں جو لطف ہے۔ وہ چھکنے۔ اور متوالے ہونے میں نہیں۔

چاندنی خوب چھٹکی ہوئی تھی۔ یکایک موہنی نے گنگا کی طرف دیکھا۔ اور مجھ سے بولی "وہ اُس پار کیسی روشنی نظر آ رہی ہے"۔ میں نے بھی نگاہ دوڑائی۔ چِتا کی آگ روشن تھی۔ لیکن میں نے ٹال کر کہا "ملاح کھانا پکا رہے ہیں"۔

موہنی کو یقین نہ آیا۔ اُس کے چہرے پر ایک حسرتناک مسکراہٹ دکھائی دی۔ اور آنکھیں آبگوں ہو گئیں۔ ایسے دل خراش نظارے اُس کے ذکی الحس اور درد مند دل پر وہی اثر پیدا کرتے تھے۔ جو لُو کی لپٹ پھولوں کے ساتھ کرتی ہے۔

تھوڑی دیر تک وہ خاموش بےحس و حرکت بیٹھی رہی۔ پھر غمناک لہجے میں بولی "منزل مقصود پر پہنچ گیا!"

تمت